دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی

شعور و آگہی

لاہور

جنوری تا مارچ 2019ء / ربیع الثانی تا جمادی الاخریٰ 1440ھ جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 1 رجسٹرڈ نمبر S-370

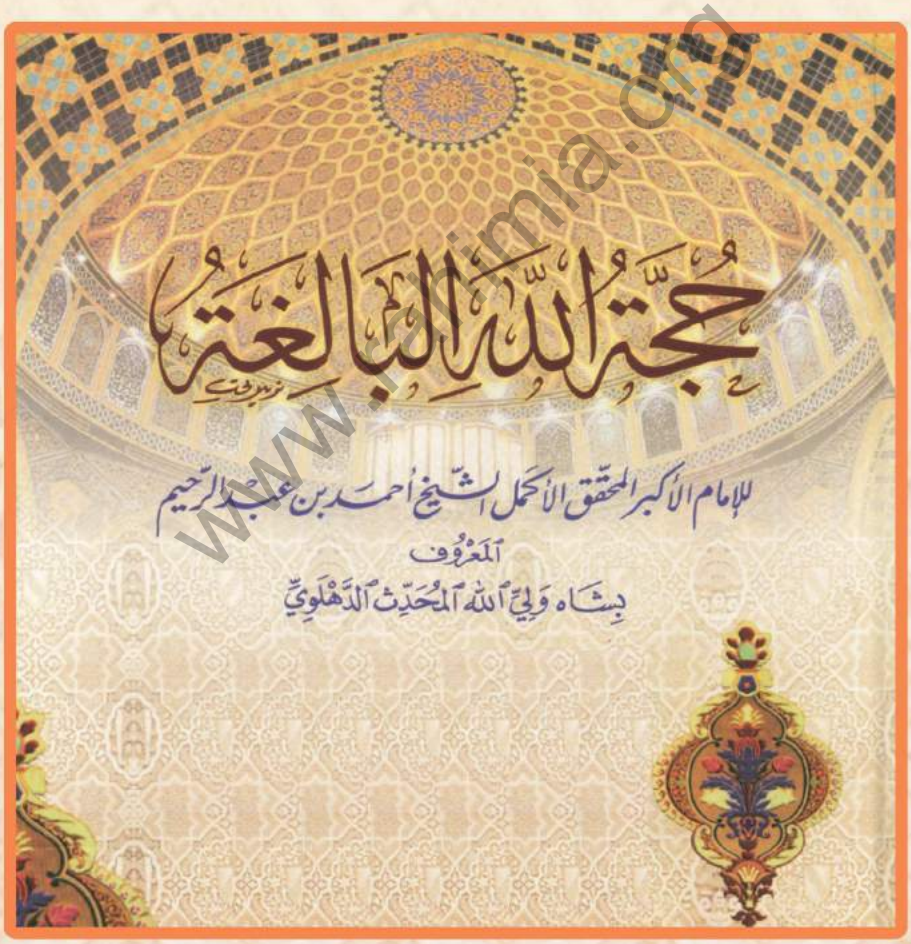

www.rahimia.org

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ لاہور

انسان کے بنیادی اَخلاق میں عدالت کا خُلق

''یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر انسانی سماج میں سماجی معاہدات ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی معاشرہ نہیں ہوتا، جس میں سماجی معاہدات نہ ہوں۔ گھریلو معاشرتی زندگی بھی ایک معاہدے کے تحت وجود میں آتی ہے۔ معاہدۂ نکاح کے تحت دو خاندانوں کے درمیان سماجی تعلق اور خاندانی نظام وجود میں آتا ہے۔ خرید وفروخت کے معاہدات کی اساس پر بازار کا نظام قائم ہوتا ہے۔ اسی سماجی اور عمرانی معاہدے (Social Contract) کی اساس پر قومی سیاسی، معاشی، سماجی نظام بھی بنتا ہوتا ہے۔ آئینی، قانونی اور عدالتی ڈھانچہ بھی عمرانی معاہدے پر استوار ہوتا ہے۔ سیکیورٹی فورسز کا نظام بھی اُسی سماجی معاہدے کے ذیل میں آتا ہے۔ پھر ممالک اور اقوام کے درمیان بین الاقوامی معاہدات بھی ہوتے ہیں۔

ان تمام معاہدات میں بہر حال دو یا دو سے زائد فریق ہوتے ہیں۔ ان فریقوں کے درمیان جو بھی معاہدہ ہو، اس کی ممکنہ شکلیں دو ہی ہیں: (۱) عدل اور (۲) ظلم۔ اس معاہدے میں دونوں فریقوں کی حیثیت برابر ہے تو اس کو ''عدل'' کہیں گے۔ اگر دونوں فریقوں کی حیثیت برابر نہیں ہے، ایک کا پلڑا بھاری اور دوسرے کا پلڑا ہلکا ہے تو اس کو ''ظلم'' کہیں گے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ تمام انسانیت اس پر متفق ہے کہ تمام سماجی معاہدات میں عدالت بنیادی خُلق ہے۔ عدالت کی تشریح شاہ صاحبؒ نے کی کہ یہ ایک ایسا ملکہ (capability) ہے کہ جس کے ذریعے سے کسی مملکت کا نظام انصاف کی بنیاد پر درست طریقے سے قائم کرنے کی اہلیت، صلاحیت اور مہارت پیدا ہو جائے۔ یہ محض انفرادی عدل نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کے ساتھ اچھے اَخلاق کا مظاہرہ کرے، بلکہ انسانی معاشرے میں عدل کے اصولوں پر مملکت کا بہترین سسٹم بنانا ملکہ عدالت ہے۔''

(علمِ اَسرار الدین: فلسفةُ التّشريع الإسلامی، ص 46)

www.rahimia.org

دینی شعور اور سماجی آگہی کا نقیب علمی، تحقیقی مجلّہ

سہ ماہی شعور و آگہی لاہور

جنوری تا مارچ 2019ء / ربیع الثانی تا جمادی الاخریٰ 1440ھ | جلد نمبر 11 شمارہ نمبر 1 | رجسٹرڈ نمبر 370-S

بانی حضرت اقدس مولانا شاہ سعید احمد رائے پوری قدس سرہٗ السعید

مجلس ادارت

سرپرست	مدیرِ اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر سعید الرحمٰن	حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری
صدر	**مدیر**
مفتی عبدالمتین نعمانی	مولانا محمد عباس شاد

مجلس مشاورت

☆ مفتی محمد اشرف عاطف	لاہور	☆ ڈاکٹر سید لیاقت علی شاہ معصومی	سکھر	☆ پروفیسر ڈاکٹر تاج افسر	اسلام آباد
☆ مفتی عبدالقدیر	چشتیاں	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد ناصر	جھنگ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد سعید اختر	اسلام آباد
☆ مفتی محمد مختار حسن	نوشہرہ	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد افضل	سعودی عرب	☆ پروفیسر قاضی محمد یوسف	حسن ابدال
☆ مولانا عبداللہ عابد سندھی	شکارپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر ابرار محی الدین	بہاولپور	☆ پروفیسر ڈاکٹر محمد جہانگیر	لاہور

قیمت فی شمارہ : -/200 روپے

سالانہ زرِتعاون -/800 روپے

شعبۂ مطبوعات

ادارہ رحیمیہ علوم قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور

رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور

Ph: 0092-42-36307714 , 36369089 - Web: www.rahimia.org

مدیر اعلیٰ مفتی عبدالخالق آزاد طابع وناشر نے اے جے پرنٹرز 28/A نسبت روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر سہ ماہی مجلّہ ''شعور و آگہی'' رحیمیہ ہاؤس 33/A کوئینز روڈ لاہور سے شائع کیا۔

www.rahimia.org

فہرست مقالات

اداریہ	حرفِ اوّل	مدیرِ اعلیٰ	3
ولی اللّٰہی افکار؛ عصری اہمیت	علمِ اَسرارِ الدّین: فلسفۃُ التّشریع الإسلامی حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم وافکار کا اَساسی علم اور فلسفہ (2)	از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری ☆	5
مطالعۂ تحریکاتِ آزادی	آزادی اور حریت کا پیغامِ فکر وعمل خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ	عناوین وحواشی حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری	73
مطالعۂ سیاسیات	پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ اور مولانا سندھیؒ کا نقطۂ نظر	تحریر پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن ☆	91
مطالعۂ تاریخ	خلافتِ راشدہ کے دور میں سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کا جائزہ	تحریر مولانا مفتی محمد مختار حسن ☆	101

www.rahmia.org

تعارف مقالہ نگار

☆ مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری — ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ (ٹرسٹ) لاہور و مسند نشین سلسلۂ عالیہ رحیمیہ رائے پور

☆ ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن — سابق پروفیسر موسیٰ پاک شہید چیئر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

☆ مولانا مفتی محمد مختار حسن — مجاز حضرت اقدس رائے پوری رابعؒ و خطیب جامع مسجد درزیاں، نوشہرہ

اداریہ

حرفِ اوّل

قوموں کو اپنی ترقی کے لیے ایک ایسے فلسفۂ فکر و عمل کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس کے ذریعے سے اُن میں وحدتِ فکری پیدا ہو، سیاسی اور معاشی نظام مستحکم بنیادوں پر قائم ہو۔ قومیں اپنے عروج کے زمانے میں طے کردہ فلسفے کی اساس پر عملی سیاسی نظام بناتی اور کامیابی کے مراحل طے کرتی ہیں، لیکن کسی وَجہ سے اگر اُن پر زوال آجائے تو انھیں پستی سے نکالنے اور دوبارہ عروج حاصل کرنے کے لیے اپنی تاریخ کھنگالنا پڑتی ہے۔ تحقیق و تجزیے کے بعد دورِ عروج میں معروضی اور ضمنی مسائل کے حل کے لیے اٹھائے گئے عارضی اقدامات اور کاموں کو نظرانداز اور بنیادی اصول اور قواعد کو علمی طور پر متعین کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو علوم اور افکار وجود میں آتے ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب میں سمجھنا ضروری ہوجاتا ہے۔ علوم کو مرتب اور مربوط بنا کر اس کا مرکزی فلسفہ و فکر متعین کیا جاتا ہے۔ اس طرح آنے والی نسلوں کو زوال سے نکلنے اور ترقی کی منازل طے کرنے کا ہدف دیا جاتا ہے۔

اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ہی برعظیم پاک و ہند کا زوال شروع ہوچکا تھا۔ مسلمانوں کا ہزار سالہ دورِ عروج اور ہندوستان میں آٹھ سو سالہ کامیاب دورِ حکومت ختم ہورہا تھا۔ تنزل کے اس دور میں ضرورت تھی کہ ایک جامع اور مربوط فلسفہ و فکر متعین کیا جائے۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ ہندوستان میں اسلامی تاریخ کے ادوار کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: ''سلطان محمود غزنوی (۴۱۲ھ/ 1021ء میں سلطان محمود نے قنوج کے راجہ کے فوجی اتحاد کو شکست دی) سے شروع کر کے امیر تیمور کے حملے (1398ء میں امیر تیمور نے سلطان ناصرالدین محمود شاہ تغلق کو شکست دی) تک ہم ہندوستانی تاریخ کا پہلا دور مانتے ہیں۔ اور امیر تیمور (1398ء) سے بہادر شاہ (ظفر 1857ء) تک دوسرا دور۔ دوسرے دور میں (اورنگ زیب) عالم گیرؒ (1707ء) کے بعد تنزل شروع ہوا۔ عموماً تنزل شروع ہونے کے بعد ہی قوموں کا فلسفہ متعین ہوتا ہے۔ ہمارے امام الائمہ (امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ) بھی اسی عہد کے امام الانقلاب ہیں۔'' (خطبات و مقالات، ص 96-395) یہ ایک حقیقت ہے کہ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے عہد میں سیاسی، معاشی اور فکری زوال کو دیکھتے ہوئے دینِ اسلام کی عالم گیر تعلیمات کا فلسفۂ فکر و عمل متعین کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے انسانی معاشروں کی ترقی کے ضروری علوم مرتب اور مدوّن کیے۔ علم کی تدوین کا مطلب کسی ایک شعبۂ زندگی میں درپیش مسائل حل کرنے کے قواعد و ضوابط کو باقاعدہ قانونی اور علمی زبان میں مرتب اور منضبط انداز میں سمجھنا اور سمجھانا ہوتا ہے۔ یہ اس شعبے کا ''علم'' کہلاتا ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ نے انسانی زندگی کے تمام ضروری شعبہ جات کے علوم مثلاً ''علم الارتفاقات'' اور ''علم الاقترابات'' وغیرہ کی تدوین و ترتیبِ نو قائم کی۔ دینِ اسلام کی بنیاد قرآن حکیم اور نبی اکرمؐ کی احادیث پر ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے علومِ قرآنیہ اور علومِ نبویہ کو ازسرِنو علمی طور پر مہذب اور مرتب بنایا۔ قرآن فہمی اور حدیث فہمی کے بنیادی علوم متعین کیے۔ قانون اور فقہ سے متعلق علوم کا خلاصہ مرتب کیا۔ انسانی روح سے متعلق ''علم الاحسان و السلوک'' کو ''علم الحقائق'' سے الگ کر کے افراط و تفریط سے پاک کیا اور دونوں علوم کو مہذب بنایا۔ سیاست و معیشت سے متعلق

www.rahnimia.org

امور کی درست تفہیم کے لیے نبی اکرمؐ کے اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں ''علم الخلافۃ والسیاسۃ'' مرتب کیا۔ اسی طرح ''علم المعیشت'' کی تعریف اور اس کے بنیادی قوانین اور ضابطے متعین کیے۔ ایسے سینکڑوں علوم کی ایک طویل فہرست ہے، جنھیں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بڑی جدوجہد اور کاوش کے ساتھ مدوّن اور مرتب کیا ہے۔ یہ علوم انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات میں ایک واضح فکر اور لائحۂ عمل مرتب کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔ معاملات کو علمی اور فنی بنیادوں پر سمجھنے سے ہی کسی قوم کا عملی نظام وجود میں آتا ہے۔ غیر علمی اور غیر سائنٹفک رویہ قوموں کے زوال کا سبب بنتا ہے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے انسانی سماج سے متعلق علوم کی تہذیب و ترتیب کے ساتھ یہ بنیادی کام بھی کیا کہ ان تمام علوم کو ایک مربوط فلسفیانہ نظام کے تحت سمجھا جا سکے۔ اس لیے کہ کسی مرکزی نقطے اور فلسفے کے تعین کے بغیر بکھرے ہوئے علوم کے ماہرین وحدتِ فکری کے بجائے بسا اوقات انتشارِ فکر کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ سوسائٹی کا نظام چلانے والے لوگوں میں وحدتِ فکر و عمل ہو تو وہ زیادہ بہتر طریقے سے ملک اور قوم کی اجتماعی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔ بہترین اور عمدہ نظم و نسق بھی ایک مرتب اور منظّم فکر و فلسفے سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ برعظیم پاک و ہند کو زوال سے نکالنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ نہ صرف انسانی زندگی کے ضروری شعبوں سے متعلق علوم کی تہذیب و تدوین کی جائے، بلکہ تمام جماعتوں اور گروہوں کو ایک بہترین فلسفے کے تحت اپنی اجتماعی شیرازہ بندی کے لیے صحیح خطوط پر جدوجہد اور کوشش کا موقع دستیاب ہو۔ اس طرح برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے انسانوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے متعین کردہ فلسفۂ فکر و عمل کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے متعین کردہ اس فلسفۂ فکر و عمل کو ''علمِ اسرارِ دین'' کے عنوان سے مرتب کیا ہے۔ یہ علم دراصل تمام ادیانِ عالم کے مسلمہ بنیادی اصول و قواعد کو مربوط انداز میں سمجھانے اور خاص طور پر تشریعِ اسلامی کے بنیادی فلسفے کی تفہیم ہے۔ اسی لیے ''علمِ اسرارِ دین'' کو ''**فلسفة التّشريع الإسلامي**'' کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آج کے اس ماحول میں شاہ صاحبؒ کے اس فلسفۂ فکر کو سمجھنے کی ضرورت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس لیے کہ ہر شعبۂ زندگی میں ہمارا زوال ہنوز جاری ہے۔ اس سے نکلنے کے لیے بلند فکری، مستحکم سیاسی سوچ اور معاشی خوش حالی کا مربوط فکر و فلسفہ اختیار کرنا وقت کی ضرورت اور پُکار ہے۔

اس شمارے کا پہلا مقالہ ''علمِ اَسرار الدین: **فلسفةُ التّشريع الإسلامي** (حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کا اَساسی علم اور فلسفہ)'' کے عنوان سے ہے۔ یہ مقالہ دراصل ملک کی وقیع جامعہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں اپریل 2017ء میں منعقد چار روزہ لیکچرز سیریز میں ایک خطبے کے طور پر دیا گیا تھا۔ اس خطبے کو یونیورسٹی کی انتظامیہ نے ''چار روزہ خطباتِ ملتان'' کی صورت میں شائع بھی کر دیا ہے۔ وقت کی کمی کے باعث لیکچر کے موقع پر اس موضوع کے صرف بنیادی نکات بیان کیے گئے تھے۔ اسے مقالے کی صورت ترتیب دیتے وقت شاہ صاحبؒ کی کتابوں سے اصل عبارات شامل کر دی گئی ہیں۔ نیز حوالہ جات کی تخریج اور حک و ترمیم اور مفید اضافوں کے بعد یہ مقالہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ولی اللّٰہی فکر و فلسفے کا ایک پورا خلاصہ بن گیا ہے۔

اس شمارے کا دوسرا مقالہ جامعہ ملیہ کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے خطبہ صدارت کے تحقیقی متن پر مشتمل ہے، جس میں حوالہ جات کی تخریج بھی کر دی گئی ہے۔ جب کہ تیسرے مقالے میں قومیتوں کے مسائل کے حل کے حوالے سے مولانا سندھیؒ کے نقطہ نظر کا جائزہ لیا گیا اور چوتھے مقالے میں خلافتِ راشدہ کے ادوار کا اجمالی جائزہ پیش خدمت ہے۔ (مدیرِ اعلیٰ)

www.rahimia.org

ولی اللّٰھی افکار؛ عصری اھمیت

علمِ اَسرارِ الدین: فلسفةُ التّشریع الإسلامی

حضرت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کا اَساسی علم اور فلسفہ

از حضرت مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(2)

(پاکستان کی معروف تعلیمی درس گاہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں موسیٰ پاک شہید چیئر شعبہ علومِ اسلامیہ کے زیرِاہتمام ''امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار اور عصرِ حاضر'' کے عنوان پر حضرت مولانا مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری دامت برکاتہم (ناظم اعلیٰ ادارہ رحیمیہ علومِ قرآنیہ ٹرسٹ لاہور) نے اپریل 2017ء میں درجِ ذیل موضوعات پر چار روزہ لیکچر دیے:

1۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف
2۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ اَسرارِ دین
3۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ معیشت
4۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نظریۂ ارتفاقات

ان میں پہلا لیکچر 17/ اپریل 2017ء بروز سوموار کو ہوا تھا، جسے تحقیق و تخریج کے ساتھ ''شعور و آگہی'' کے گزشتہ شمارے میں شائع کیا جا چکا ہے۔ دوسرا لیکچر مؤرخہ 18/ اپریل 2017ء بروز منگل کو سیمینار ہال، شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان میں ہوا۔ اس سیشن کی صدارت پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم (چیئرمین شعبہ عربی، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی) نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض پروفیسر ڈاکٹر جمیل احمد نتکانی (شعبہ علومِ اسلامیہ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی) نے سرانجام دیے۔ ان مجالس میں شعبہ علومِ اسلامیہ کے اساتذہ، طلبا، ملتان شہر سے اہلِ علم و دانش اور علمائے کرام نے بھی شرکت کی۔ لیکچر کے بعد سوال و جواب کی نشست بھی ہوئی۔ اس کے بعد صدرِ مجلس نے صدارتی کلمات ارشاد فرمائے۔

پیشِ نظر مقالہ اسی لیکچر سیریز کے دوسرے خطبے پر مشتمل ہے۔ حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے جو خطبہ دینے کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی کتابوں سے بہت سے اقتباسات جمع کیے تھے۔ مقالے کی تخریج و تحقیق کرتے ہوئے انھیں متعلقہ مقامات پر مقالے میں شامل کر دیا گیا ہے، تاکہ شاہ صاحبؒ کی اصل عبارتیں بھی قارئین کے سامنے آجائیں۔ اس مقالے پر حضرت رائے پوری مدظلہٗ نے نظرِ ثانی اور تحقیق و تخریج کی ہے اور اسے تحریری صورت دیتے ہوئے عبارتوں کی نوک پلک درست اور حک و اضافہ بھی کیا ہے۔ اس طرح یہ دوسرا لیکچر بھی ایک مکمل مقالے کی صورت اختیار کر گیا ہے، جسے قارئین مجلّہ ''شعور و آگہی'' کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

www.rahimia.org

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہٖ الکریم. اما بعد!

فأعوذ باللّٰہ من الشّیطان الرّجیم. بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم. قال اللّٰہ تبارک و تعالیٰ:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۭ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ (1)

و قال النّبیّ ﷺ: ''من یّرد اللّٰہ بہٖ خیراً یُفقّھہ فی الدّین.'' (2)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہٗ النّبیّ الکریم.

گزشتہ روز کے لیکچر کا خلاصہ

صاحبِ صدر اور معزز حاضرین!

کل سے ہم حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم و افکار کے حوالے سے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کل حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت کے تعارف اور اُن کے علوم کے اجمالی تذکرے کے اختتام پر جو بنیادی باتیں ہمارے سامنے آئیں، وہ یہ تھیں کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنے دور کے حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد فکری انتشار کو دور کرنے، سیاسی عدمِ استحکام اور معاشی طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے باقاعدہ ایک جامع دینی نظامِ فکر و عمل مرتب اور مدوّن کیا ہے۔ کل کی گفتگو میں اس کے دو بنیادی پہلو ذکر کیے گئے تھے:

1۔ ایک تو یہ کہ شاہ صاحبؒ نے ایسے علوم مرتب کیے، جن کے ذریعے سے انسانی سماج میں وحدتِ فکر و عمل پیدا کی جاسکتی ہے۔ اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے علوم القرآن کے حوالے سے پانچ نئے علوم متعارف کرائے۔ علوم الحدیث سے اخذ و استفادہ کا ایک واضح طریقۂ کار متعین کیا۔ صحابہ کرامؓ کی آرا اور اُن کے اجماع سے متعلق تحقیقی غور و فکر کا صحیح طریقۂ کار اور منہج واضح کیا۔ گویا کہ علومِ قرآنیہ سے استفادے کے لیے ایک واضح ''**الجادّۃ القویمۃ**'' یعنی شاہراہِ فکر و عمل متعین کی۔

2۔ شاہ صاحبؒ نے دوسرا بنیادی کام یہ کیا کہ ایک مکمل اور جامع فلسفہ مرتب اور مدوّن کیا۔ کوئی بھی سوسائٹی اس وقت تک ترقی نہیں کرتی، جب تک کہ وہاں بسنے والے لوگ جن علمی اور فکری بنیادوں پر اپنا سیاسی، معاشی اور سماجی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، اس کا ایک مربوط فلسفہ پیشِ نظر نہ رکھیں۔ معاشروں کی تشکیل میں فکر و فلسفہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی فلسفے کی اساس پر افکار و نظریات مرتب ہوتے ہیں۔ پھر ان افکار کی روشنی میں سیاسی، معاشی اور سماجی نظام بنائے جاتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جہاں علومِ قرآنیہ کے ذریعے قرآن حکیم اور دین کے فہم کا راستہ کھولا، وہاں دین کا بنیادی فلسفہ بھی مرتب اور مدوّن کیا، جسے خود شاہ صاحب نے ''علم اسرار الدین'' کا عنوان دیا ہے۔ بعد میں آنے والوں نے اسی کو ''**فلسفۃ التّشریع الإسلامی**'' کا نام دیا ہے۔ اس علم میں شاہ صاحبؒ نے تمام شرائع بالخصوص دینِ اسلام کے تشریعی پہلوؤں کی بنیادی فلاسفی بیان کی ہے۔

کل کی گفتگو میں ایک اَور بات بھی عرض کی گئی تھی کہ شاہ صاحبؒ نے ایک علم ''**علم الجمع بین المختلفات**'' یعنی ''**علم تطبیق الآراء**'' بھی مرتب اور مدوّن کیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی عرض کی گئی تھی کہ تطبیق کا مطلب محض دو آرا کے

www.rahimia.org

درمیان کھینچ تان کر ہم آہنگی پیدا کرنا نہیں، بلکہ اس مسئلے سے متعلق حقیقی اور واقعی صورتِ حال کا تعین کرنا اور پھر ان آرا کا اس دریافت شدہ واقعی حقیقت سے مقابلہ کر کے تجزیہ کرنا ہے کہ وہ رائے کس حد تک اس واقعی حقیقت کے مطابق ہے یا اس سے منحرف ہے؟ اور انحراف کس درجے میں ہے؟ ہم سب جانتے ہیں کہ جب کوئی خبر بیان کی جاتی ہے، اگر وہ واقع کے مطابق ہو تو اسے سچ کہا جاتا ہے اور اگر واقع کے مطابق نہ ہو تو وہی جھوٹ کہلاتی ہے۔ اس کے لیے پہلے حقیقتِ واقع کا تعین ہونا ضروری ہے۔

یہ بھی عرض کیا گیا تھا کہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد اُن کے صاحبزادے امام شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے ''علم تطبیق الآراء'' پر اپنی کتاب ''تکمیل الأذھان'' میں ایک مستقل باب قائم کر کے اس کے فنی امور مرتب اور مدوّن کیے ہیں۔ انھوں نے تطبیق کی حقیقت و ماہیت واضح کرتے ہوئے چند بنیادی نکات بیان کیے ہیں۔ انھیں سمجھنا انتہائی ضروری ہے، تاکہ حکمت اور فلسفے کے بنیادی و اساسی امور واضح ہو سکیں۔

فلسفہ کی تعین کی ضرورت

فلسفے کے تعین کی ضرورت یوں بھی پیش آئی کہ شاہ صاحبؒ سے پہلے فلسفے کے بہت سے مکاتبِ فکر موجود تھے۔ فلسفہ اور فکر کے حوالے سے درجِ ذیل مکاتبِ فکر موجود رہے ہیں:

1۔ فلاسفۂ یونان میں ''مشّائین'' یعنی مادی نقطہ نظر سے کائنات کا مطالعہ کرنے والوں نے اپنا فلسفہ مرتب اور مدوّن کیا، اہلِ علم جانتے ہیں کہ ''ہیولیٰ''، ''صورتِ جسمیہ'' اور ''عقولِ عشرہ'' کی بنیاد پر اُن کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔

2۔ فلاسفۂ یونان میں ایک اَور مکتبِ فکر کشف و اشراق کی بنیاد پر رہا ہے، جنھیں ''إشراقیّین'' کہا جاتا ہے۔

3۔ فلسفۂ مشّائین کے حوالے سے مسلمانوں میں علم الکلام کے محققین کو ''مُتکلّمین'' کہا جاتا ہے۔

4۔ فلسفۂ اِشراقیّین سے متأثر ''متأخرینِ صوفیا'' کا ''فلسفۂ تصوف'' چوتھا فلسفیانہ سکول ہے۔

5۔ محدثین، فقہا اور مجتہدین کے مذاہب و مسالک پر مشتمل فقہی مسالک اور آرا کا اختلافی فلسفہ بھی ہے۔

شاہ صاحبؒ کے فلسفے کی تشریح میں شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے کئی کتابیں لکھی ہیں، جن میں ''دَمْغُ الباطِل'' بڑی ضخیم کتاب ہے۔ ان کی ایک کتاب ''تکمیلُ الأذھان'' لاجواب ہے۔ ''أسرارُ المَحَبّة'' ان کی تیسری کتاب ہے، جس میں انھوں نے اس حوالے سے بہت سے بنیادی امور واضح کیے ہیں۔ ان کے بعد حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے ''عبقات'' لکھی، جس میں شاہ صاحبؒ کے فلسفے کے بہت سے امور کو عقلی بنیادوں پر واضح کیا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کے ان دو بڑے شارحین نے ان تمام مکاتبِ فکر کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور شاہ صاحبؒ کے فکر و فلسفے سے ان کا موازنہ کیا ہے۔

علم کے تین بنیادی ذرائع

ان دونوں حضرات کا اس بات پر اتفاق ہے اور دلائل سے انھوں نے یہ بات ثابت کی ہے کہ علم کے حصول کے تین ذرائع؛ عقل، نقل اور کشف و وِجدان ہیں۔ چناں چہ حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ ''تکمیل الأذھان'' میں لکھتے ہیں:

''طرق اقتناس العلم: عقل، و نقل، و کشف. والحِسّ شرط للکلّ، و وسیلة إلیه.'' (3)

(علم حاصل کرنے کے تین طریقے ہیں: (۱) عقل اور (۲) نقل اور (۳) کشف۔ ان تینوں کے لیے حس کا ہونا ضروری شرط ہے اور وہ ان کے حصول کا ذریعہ ہے۔)

اسی طرح حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ''عبقات'' میں لکھتے ہیں:

''**أسباب العلم المعتد به ثلاثة:**

العقل: وهو الانتقال من المعلوم إلٰى المجهول. و النّقل، و الكشف.'' (4)

(حقیقتِ واقعی کے حوالے سے علم کے تین بنیادی اسباب ہیں:

(۱) عقل: جس کے ذریعے سے انسان معلوم سے مجہول کا علم حاصل کرتا ہے۔ (۲) نقل اور (۳) کشف۔)

اس سے معلوم ہوا کہ علم کے بنیادی ذرائع تین ہوتے ہیں:

پہلا ذریعۂ علم عقل ہے کہ جس کے ذریعے سے تجربات اور مشاہدات کیے جاتے ہیں اور اس سے جو نتائج سامنے آتے ہیں، وہ عقلی نتائجِ فکر کہلاتے ہیں۔ تجرباتی اور مشاہداتی نتائجِ فکر سے جو علم وجود میں آتا ہے، وہ عقلی علم کہلاتا ہے۔

دوسرا ذریعۂ علم نقل ہے۔ کسی نبی سے یا کسی حکیم سے کوئی بات نقل در نقل راویوں اور کتابوں کے ذریعے سے آپ تک پہنچی ہے۔ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کے حاملین انبیّا ہوں یا وہ حکما اور عقلا ہوں، جن کو کسی بھی ذریعے سے علم حاصل ہوتا ہے۔ اور یقیناً وہ ذریعہ اُن کی اپنی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہوتا ہے، انھیں کی روشنی میں ان حکما پر بھی کچھ چیزیں وارد ہوتی ہیں، جو بعد میں نقل در نقل اور روایت در روایت چلی آتی ہیں۔ انسان ان سے استفادہ کرتا ہے۔

تیسرا اور اہم ترین ذریعۂ علم کشف و وِجدان ہے۔ انسان پر وِجدانی طور پر کسی علم کا انکشاف ہوتا ہے۔ جب کوئی علمی ماہر کسی خاص شعبے پر مخصوص توجہ دیتا ہے، اس کے علوم و افکار، قاعدوں ضابطوں اور علمی تقاضوں پر یکسو ہو کر غور و فکر کرتا ہے، بہ ظاہر اس کا دماغ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہا ہوتا ہے۔ پھر اچانک اس غور و فکر کے دوران اس پر ایک کشف کی حالت طاری ہوتی ہے، خواہ کوئی شعبہ بھی ہو۔ اچانک پیش آمدہ مسئلے کے حل کے حوالے سے اس کے دماغ میں ایک خیال کا کوندا لپکتا ہے اور جو عقدۂ لاینحل اور مشکل درپیش ہوتی ہے، وہ فوراً حل ہو جاتی ہے۔ اب چاہے صوفیا یا اولیا کا کشف ہو یا محققین حکما کا کشف ہو۔

اس کشف کی شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب ''**سطعات**'' میں چھ اقسام بیان کی ہیں۔ (5) اس کی ایک شکل خواب ہے کہ انسان خواب میں بعض ایسی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، جو کچھ عرصے بعد اس کے سامنے حقیقت بن کر آجاتی ہیں۔ اس طرح سچے خواب سے مستقبل کا کوئی معاملہ اس کے سامنے منکشف ہو جاتا ہے۔ اس طرح کشف و وِجدان کی کئی اقسام ہیں۔ کشف کی جامع ترین قسم وحیٔ الٰہی ہے، جیسے غارِ حرا میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر براہِ راست فرشتے کی آمد کے ذریعے سے دوٹوک اور قطعی انداز میں پہنچی تو یہ وحی الٰہی کشف کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اس طرح علم کے حصول کے تین بنیادی ذرائع ہیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی علمی جامعیت

ان تینوں ذرائع علم کے حوالے سے مختلف مکاتبِ فکر کا تجزیہ کرتے ہوئے حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ لکھتے ہیں:

''**المشّاؤن متجرّدون للعقل، و المحدّثون للنّقل، و متأخّرون الصّوفية للكشف، و أمّا**

المتکلّمون فکلامھم خلط بین نقل و عقل، و الإشراقیة بین عقل و کشف، و الجامعون بینھما علیٰ اعتدال ندر.'' (6)

یعنی جہاں تک ''عقل'' کا معاملہ ہے، اس ذریعۂ علم کو صرف ایک طبقے، یعنی ''حکمائے مشائین'' نے اختیار کیا ہے۔ جہاں تک ''نقل'' کا معاملہ ہے، اسے صرف ''محدثین'' نے پیش نظر رکھا ہے۔ جہاں تک ''کشف'' کا معاملہ ہے، اسے ''متأخرین صوفیا'' یعنی بعد میں آنے والے صوفیا نے اختیار کیا ہے۔ انھوں نے کشف کو ہی واحد ذریعۂ علم بنا لیا اور باقی دو کو پیش نظر نہیں رکھا۔ ''متکلمین'' نے ''عقل اور نقل'' دونوں کو پیش نظر رکھا اور ''کشف'' کو سِرے سے چھوڑ دیا۔ ''حکمائے اشراقیین'' نے ''کشف اور عقل'' دونوں کو ملایا، مگر ''نقل'' یعنی شریعت کو چھوڑ دیا۔ گویا کہ جتنے بھی فلاسفہ کے طبقات ہیں، انھوں نے تینوں ذرائع علم میں سے کسی ایک یا دو کو اختیار کیا۔ اس طرح یہ فلسفی خواہ وہ مشائین ہوں، یا اشراقیین، متأخرین صوفیا ہوں یا متکلمین، یا صرف روایات جمع کرنے والے محدثین ہوں، انھوں نے کسی ایک علم کو سامنے رکھتے ہوئے آرا قائم کی ہیں۔

شاہ رفیع الدین دہلویؒ فرماتے ہیں کہ وہ لوگ جو ان تینوں ذرائع علم کے جامع ہیں، وہ انسانی تاریخ میں بہت کم رہے ہیں۔ ان میں اس دور کا سب سے بڑا نمایاں نام ''**افضل المحقّقین** حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ'' (7) کا ہے۔

حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ نے ایک اور حقیقت بھی واضح فرمائی کہ:

''و کلّ منھا (أی عقل، نقل و کشف) إذا استجمع شروط صحتہٖ کان مطابق الواقع، فامتنع أن یکون متناقضة بالحقیقیة لئلاَّ یلزم اجتماع النقیضین.'' (8)

(یہ تینوں ذرائع علم جب صحیح شرائط کے ساتھ کسی جگہ جمع ہو جائیں تو ان سے ثابت شدہ چیز واقع کے مطابق ہوتی ہے۔ ان تینوں ذرائع کا کسی حقیقتِ واقعی کے بارے میں مختلف ہونا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔)

یہ تینوں ذرائع علم کسی واقع کے تعین میں متفق ہونے چاہئیں کہ حقیقتِ واقعہ یہی ہے، کیوں کہ جب کائنات ایک ہے تو حقیقتِ واقعہ بھی ایک ہے۔ چناں چہ علم کے ان تینوں ذرائع کا متفق ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی مسئلے میں تینوں ذرائع علم کے نتائج ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ذرائع علم میں سے کسی نہ کسی ذریعۂ علم میں نقص ہے۔ اس علم کے حامل نے ٹھیک طریقے سے اس شئے کا مطالعہ نہیں کیا۔ جب کائنات کی چیزیں ایک ہیں تو کشف صحیح، عقل صحیح اور نقل صحیح کے نتائج متفق ہونے چاہئیں۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور علمِ اسرارِ دین

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے علمِ اسرارِ دین کی ترتیب و تدوین میں ان تینوں ذرائع علم سے علمی حقائق متعین کیے ہیں۔ یہ بڑا بنیادی کام ہے۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے یہ دعویٰ بالکل بجا طور پر کیا ہے کہ یہ علم جو میں نے مرتب اور مدوّن کیا ہے، پچھلے ہزار سال میں کسی نے اس جامعیت کے ساتھ مرتب نہیں کیا۔ یقیناً جزئیات یا فروعات رہی ہیں اور کچھ لوگوں نے احکامِ شرعیہ کے کچھ فائدے اور اسرار و رموز بھی ضرور بیان کیے ہیں، جیسے علامہ خطابی نے ''**سنن ابو داؤد**'' کی شرح ''**معالم السُّنن**'' لکھی۔ شیخ

عزالدین ابن عبدالسلامؒ نے ''**قواعد الأحكام فی مصالح الأنام**'' لکھی ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''**الجُزءُ اللّطیف**'' میں لکھا ہے:

''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (9) ونعمتِ عظمیٰ بریں ضعیف آں است کہ اُورا خلعتِ فاتحیت دادند، و فتحِ دورۂ بازپسیں بر دستِ وئے کردند، و ارشاد فرمودند کہ مرضی در فقہ چیست آں را جمع کردہ فقہِ حدیث از سرِ بنیاد کرد، و اَسرارِ حدیث و مصالحِ احکام، و ترغیبات، و سائر آں چہ حضرت پیغامبر ﷺ از خدائے تعالیٰ آوردہ اند و تعلیم فرمودہ اند۔ و آں فنّے است کہ پیش ازیں فقیر، مضبوط تر از سخنِ ایں فقیر کسے آں را نہ کردہ است، باوجود جلالت آں فن۔ اگر کسے را دریں حرف شبہ باشد، گو کتاب ''**قواعدِ کُبریٰ**'' بہ بیں کہ شیخ عزالدینؒ آں جا چہ جہد ہا کردہ بہ عشرِ عشیر ایں فن فائز نہ شدہ۔''(10)

(ارشادِ خداوندی ہے کہ: ''جو تجھے اپنے ربّ کی نعمت ملی ہے، اُسے بیان کر۔'' اس ضعیف بندے پر اللہ کی جو عظیم نعمتیں ہوئی ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اُس نے اس دور کا دروازہ کھولنے کی خلعت مجھے عطا فرمائی ہے کہ میرے ہاتھ سے اس آخری دور کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ اور ارشاد فرمایا ہے کہ فقہ میں اُن کی مرضی یہ ہے کہ فقہِ حدیث کو اصل بنیاد سے جمع کیا جائے۔ حدیث کے اسرار و رموز، احکامِ شرعی کی مصلحتیں اور اُس کی ترغیبات اور خدائے تعالیٰ سے جو کچھ حضرت پیغمبر ﷺ لے کر آئے ہیں، اس کی تعلیم دی جائے۔

یہ ایک ایسا فن ہے کہ اس فقیر سے پہلے اس طرح کی مضبوط گفتگو کسی اَور نے نہیں کی۔ حال آں کہ یہ فن بہت اونچے مرتبے کا حامل ہے۔ اگر کسی کو اس بات میں شبہ ہو تو وہ شیخ عزالدین (عبدالعزیز بن عبدالسلام دمشقیؒ) کی کتاب ''**قواعدِ کُبریٰ**'' (**قواعد الأحكام فی إصلاح الأنام**) دیکھے کہ جس میں انھوں نے احکام کے اسرار و رموز بیان کرنے کی بہت کوشش کی ہے، لیکن وہ اس فن کے متعلق میری گفتگو کے دسویں حصے کے برابر بھی نہیں ہے۔)

ایک اَور بات بھی شاہ صاحب نے فرمائی ہے کہ:

''ہر ایک زمانے کا ایک علم ہوتا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ جس زمانے میں جس علم کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے افراد پر وہ علوم نازل کرتا ہے۔ میرا یہ زمانہ ان تینوں ذرائع علم کی جامعیت کا زمانہ ہے۔ خاص طور پر حکمتِ عملی کے تناظر میں عقل، نقل اور کشف کی جامعیت کا زمانہ ہے کہ اللہ نے اس کام کے لیے مجھے منتخب کر لیا۔''(11)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو خاص طور پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے حکمتِ عملیہ عطا فرمائی۔ چناں چہ ''**التّفهيمات الإلٰهيه**'' میں خود تحریر فرماتے ہیں:

''**علّمنی ربّی الحكمة العملية، بها صلاح هٰذه الدّورة بغاية التّفصيل، و وفّقنی لتشييدها بالكتاب، و السّنّة، و آثار الصّحابة رضی اللّٰه عنهم.**''(12)

(اللہ پاک نے مجھے انتہائی تفصیل کے ساتھ ایسی حکمتِ عملیہ (سماجی سائنس) سکھلائی کہ جس سے اس دور کی اصلاح وابستہ ہے۔ اور مجھے اس بات کی توفیق دی کہ مَیں حکمتِ عملی کے ان اصولوں کو کتاب و سنت اور صحابہؓ کے آثار کی روشنی میں مزید مضبوط بنا دوں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اس دور کی درستگی اسی حکمتِ عملیہ پر مبنی ہے۔ اس دور میں کامیابی اس حکمتِ عملی کو اختیار کیے بغیر نہیں ہوسکتی۔ اور پھر اگلی بات بھی ارشاد فرمائی کہ مجھے اللہ نے توفیق دی ہے کہ میں اس حکمتِ عملی کو کتاب و سنت اور آثارِ صحابہؓ کی روشنی میں مضبوط اور مستحکم عقلی بنیادوں پر اس کا ایک مربوط فلسفہ بنادوں۔

جیسا کہ کل کے موضوع (امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت اور فکر؛ ایک تعارف) میں بھی ذکر کیا گیا تھا کہ مجدد کی حیثیت سے ''علم الجمع بین المختلفات'' یعنی مختلف پہلوؤں یا مختلف علوم کے درمیان جمع کرنے کی اہلیت و صلاحیت اس دور کے مجدد حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی بنیادی خصوصیت ہے۔ تمام علوم میں جمع بین المختلفات کے تناظر میں واقعاتِ حقیقیہ کا تعین کرنا ہی مشکل امر ہے۔ اس کو متعین کیے بغیر علمی اختلاف اور فکری انتشار کی کیفیت ختم نہیں ہوسکتی۔ اس کے بغیر وحدتِ فکری بھی پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس کے لیے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے کتاب ''حُجّةُ اللّٰه البالِغه'' لکھی۔ اس کتاب میں بیان کردہ بنیادی علم ''علمِ أسرارِ الدّین'' ہے۔

علمِ اسرارِ دین کی تعریف

علمِ اسرارِ دین پر گفتگو کرتے ہوئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہم علمِ اسرارِ دین کی تعریف سمجھیں۔ جب تک کسی علم کی تعریف، اس کا موضوع، اس کی غرض و غایت اور اس کی افادیت و اہمیت سامنے نہ ہو تو دراصل اس علم کی اصل حقیقت سامنے نہیں آتی۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حُجّةُ اللّٰه البالِغه'' کے مقدمے میں علمِ اسرارِ دین کی تعریف یوں کی ہے کہ:

''هو علم أسرار الدّين الباحث عن حِكم الأحكام و لمّياتها، و أسرار خواص الأعمال و نكاتها.'' (13)

(علم اسرارالدین وہ علم ہے کہ جس میں:

(الف) احکام کی حکمتوں اور اُن کے اسباب وعلل اور دلائل

(ب) اور انسانی اعمال کے خواص اور اُس کے بنیادی نکات پر غور وفکر

کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے۔)

اس علم میں دو دائروں سے بحث کی جاتی ہے۔ پہلا دائرہ ''**حِكمُ الأحكام و لِمّياتها**'' ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ایک ایسا علم ہے، جس میں انسانی سوسائٹی میں جاری شدہ قوانین اور احکامات کی حکمت جاننا اور ان کے دلائل سمجھنا ہے۔ یعنی احکامات میں سے یہ حکم کس مصلحت کے تحت جاری کیا گیا؟ اور اس حکم سے کس مفسدے اور خرابی کو دور کرنا مقصود ہے؟ چوں کہ معاشرہ قانون کی پابندی سے ترقی کرتا ہے۔ ہر قانون کچھ کاموں کے کرنے کا حکم دیتا ہے اور کچھ کاموں سے روکتا ہے۔ اس لیے کہ کوئی معاشرہ — کسی بھی ملت و مذہب اور کسی بھی سکول آف تھاٹ پر قائم ہو — کچھ باتوں کے کرنے کا ''اَمر'' یعنی حکم دیتا ہے اور کچھ چیزوں سے وہ ''نھی'' یعنی روکتا ہے۔ یعنی سوسائٹی کی تشکیل کے لیے کوئی نہ کوئی حکم، قانونی نظام یا آرڈر پاس کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے انبیا علیہم السلام احکاماتِ شرعیہ جاری کریں یا اُن کی روشنی میں کوئی حکمران اور قاضی یا کسی ملک کی پارلیمنٹ اور وزیرِاعظم جاری کرے۔ اس حکم کی حکمت کیا ہے؟ اس کی مصلحت کیا ہے؟ اور اسی کے ساتھ ساتھ اس حکم کے

www.rahimia.org

پیچھے دلائل کیا ہیں؟ یہ حکم سوسائٹی پر کیوں نافذ کیا گیا ہے؟ ''حِکم الأحکام و لِمّیاتها'' کا یہی مطلب ہے۔

علمِ اسرارِ دین کا دوسرا دائرۂ بحث ''أسرار خواص الأعمال و نِکاتها'' ہے۔ کسی معاشرے میں جاری احکامات (اوامر و نہی) کی حکمتیں اس وقت تک معلوم نہیں ہوسکتیں اور اس پراسیس (process) کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا، جب تک کہ انسانی اعمال کی خصوصیات اور اُن اعمال کے بنیادی امور اور نکات کا صحیح علم نہ ہو۔ انسان صبح سے شام تک عمل کرتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں، اس کا جسم، اس کے اعضا حرکت میں رہتے اور ان سے اعمال صادر ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی اعمال کیسے وجود میں آتے ہیں؟ انسانی نفس میں اس عمل کے محفوظ رہنے کا کیا طریقۂ کار ہے؟ ان کے خواص، اثرات اور تاثیرات کیا ہیں؟ کسی عمل کا اس دنیا میں یا موت کے بعد کیا اثر اور نتیجہ نکلے گا؟ ہم اعمال کی تہذیب و ترتیب کے لیے قوانین کیوں بناتے ہیں؟ اس طرح ان اعمال کے خواص اور اَسرار و رموز اور ان سے متعلق بنیادی نکات سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بڑے دلائل کے ساتھ یہ بات واضح کی ہے کہ کائنات میں جتنی بھی چیزیں اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہیں، تخلیق کے وقت ان میں سے ہر ایک چیز میں ایک خاص خاصیت رکھی ہے۔ وہ خاصیت اس میں قیامت تک رہے گی۔ آگ جلانے کا کام کرتی ہے، قیامت تک جلائے گی۔ پانی بہاؤ رکھتا ہے، یہ اس کی خاصیت ہے۔ آکسیجن، ہائیڈروجن وغیرہ وغیرہ جتنے بھی عناصر ہیں، ہر ایک اپنی اپنی خاصیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہر ایک عمل کی بھی ایک خاصیت ہے۔ عمل کی خاصیت معلوم کرنا، اس کے اَسرار معلوم کرنا، گہرائی میں جا کر اس کے ہر پہلو سے اثرات و نتائج اور اس سے متعلق بنیادی نکات جاننا اس علم کا تقاضا ہے۔

علمِ اسرارِ دین کا موضوع

ہم جانتے ہیں کہ کسی علم میں جس چیز کے لوازمِ ذاتیہ (Essential Requisites) سے بحث کی جاتی ہے، وہی اس کا موضوع ہوتا ہے۔ علمِ اسرارِ دین کا موضوع دو دائروں پر مشتمل ہے: (۱) ''احکامات و قوانین'' اور (۲) ''انسانی اعمال''۔ انھی دونوں کے لوازمِ ذاتیہ سے اس علم میں بحث کی جاتی ہے۔ انسانی اعمال کے خواص و لوازمات پر بحث کرنے سے اس عمل کی ''حقیقتِ واقعی'' اور اس کے حقیقی اثرات معلوم ہوں گے۔ پھر اس عمل کے حوالے سے کسی بھی مذہب اور قانونی نظام کے جاری کردہ احکامات اور قانون کی صحیح حیثیت معلوم ہوگی کہ وہ کس درجے عمل کی حقیقتِ واقعی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس طرح تحقیق و تدقیق کے ساتھ اس علم کے ذریعے تمام نظام ہائے حیات کے جاری کردہ احکامات و قوانین کا جائزہ لیا جاسکے گا۔ یہ طے کیا جاسکے گا کہ کون سا حکم کسی عمل کی قرار واقعی حیثیت اور اس کے حقیقی اثرات و نتائج کے حوالے سے صحیح اور درست ہے اور کون سا حکم اس عمل کی قرار واقعی حیثیت سے کس درجے انحراف رکھے ہوئے ہے۔

علمِ اَسرارِ دین کی اہمیت اور اس کے فوائد

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کے مقدمے میں اس علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ:

''فهو ـــ و اللّٰهِ ! ـــ أحقّ العُلوم بأن يصرف فيه مَن أطاقهٗ نفائس الأوقات، و يتّخذَهٗ عُدّة لمعادهٖ بعد ما فُرض عليه من الطّاعات.'' (14)

(اللہ کی قسم! یہ علم تمام علوم میں سے اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ آدمی اپنے نفیس ترین اوقات اس علم کے پڑھنے پڑھانے میں صَرف کرے اور فرض عبادات ادا کرنے کے بعد اس علم کو اپنی آخرت کا سامان بنائے۔)

پھر شاہ صاحبؒ نے اس علم کے تین فائدے بیان فرمائے ہیں کہ:

1۔ علمِ اسرارِ دین سے انسان کو شریعت کے جاری کردہ احکامات اور اخبار و روایات کا تجزیہ کرنے کی پوری بصیرت اور شعور حاصل ہوجاتا ہے۔ اس کی چند ایک مثالیں دیتے ہوئے بتلایا کہ جس طرح:

(الف) علمِ عروض کا ماہر دیوان ہائے اشعار کا تجزیہ کرنے کی بصیرت رکھتا ہے۔

(ب) علمِ منطق کا ماہر فلاسفہ اور حکما کے عقلی دلائل کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

(ج) علمِ نحو کا ماہر خالص عربوں کے کلام کا تجزیہ کرلیتا ہے۔

(د) علمِ اصولِ فقہ کا ماہر فقہا کی جزئیات اور تفریعات کا جائزہ لے لیتا ہے۔

اسی طرح علمِ اسرارِ دین پر عبور رکھنے والا آدمی شریعتِ اسلامیہ کی نصوص اور اَحادیث و اَخبار کا مربوط نظام سمجھ کر اس کے بنیادی قواعد وضوابط اور اَسرار و حِکم کو پوری بصیرت اور شعور سے سمجھ جاتا ہے۔ الغرض! جس علم کا بھی ملکہ انسان میں پیدا ہوگیا تو اس میں بصیرت پیدا ہوگئی کہ اس کے ذریعے وہ صحیح اور غلط میں فرق و امتیاز پیدا کرسکتا ہے۔ ایسے ہی علمِ اسرارِ دین سے انسان کے لیے اللہ کے جاری کردہ احکامات اور انبیّا کی طرف سے بیان کی گئی شریعت یا دیگر ملتوں اور مذاہب کے جاری کردہ قوانین میں صحیح اور غلط میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کی بصیرت اور شعور پیدا ہوتا ہے۔

2۔ علمِ اسرارِ دین کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب انسان میں اس علم کا شعور اور بصیرت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ بڑی غلطیوں سے محفوظ ہوجاتا ہے۔ اس علم کا حاصل کرنے والا اُس آدمی کی طرح نہیں ہوتا، کہ جو:

(الف) حاطبِ لیل یعنی رات کے وقت لکڑیاں اکٹھی کرنے والے سے گیلی سوکھی ہر طرح کی لکڑی لانے کی غلطی ہوجاتی ہے۔ یا رات کو اس کا ہاتھ غلطی سے سانپ وغیرہ کسی موذی جانور پر بھی پڑ سکتا ہے۔

(ب) بغیر سوچے سمجھے کسی اندھی یا بھینگی اونٹنی پر سوار ہوجائے، جسے رات کو ایک کے دو نظر آئیں یا راستہ ہی نظر نہیں آتا۔

(ج) جس نے کسی طبیب سے سنا کہ سیب کھانا مفید ہے۔ اس نے کڑوے ترین پھل ''حنظلہ'' کی ظاہری شکل وصورت سیب کی طرح دیکھ کر اسے کھا لیا۔

اس طرح شاہ صاحبؒ نے ان تین مثالوں کے ذریعے سے سمجھایا کہ جیسے بھینگی اونٹنی پر کوئی سفر شروع کردے، جسے سامنے سے ایک کے بجائے دو نظر آرہے ہیں تو وہ مسافر کو منزلِ مقصود تک کیسے پہنچائے گی؟ جیسے وہ سوار کامیاب نہیں ہوسکتا، ایسے ہی جس کے پاس علم بصیرت نہیں ہے، تو وہ بھی ایسے ہی ہے جیسے بھینگی اونٹنی پر بیٹھا ہوا ہے۔ یا حاطب اللیل کی مثال دی ہے کہ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی کو لکڑیاں جمع کرنے کے لیے بھیجا جائے تو وہ سب رطب و یابس (خشک اور گیلی) سب طرح کی لکڑیاں اس نے جمع کیں جس میں سانپ بچھو بھی آگئے۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔ روشنی ہو تو پتہ چل جائے کہ کون سی لکڑی قابل استعمال ہے، جس سے آگ جلائی جاسکتی ہے، کون سی نہیں۔ اس علمِ اسرارِ دین سے ایسی روشنی اور بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ

www.rahimia.org

جس سے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں اور غلطی کا ارتکاب کرنے سے انسان بچ جاتا ہے۔

3۔ شاہ صاحبؒ نے اس علم کا تیسرا فائدہ یہ بیان کیا ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی شریعت پر انسان کو علیٰ وَجہ البصیرت اور واضح دلائل کے ساتھ پختہ یقین حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم نے اپنے ربّ کے واضح دلائل کی بنیاد پر ایمان و یقین رکھنے والے کے بارے میں کہا ہے کہ: اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ [15] (کیا وہ آدمی جو اپنے ربّ کی طرف سے واضح دلائل اور کھلی نشانیوں کی بنیاد پر ایمان لایا ہے، اس آدمی کی طرح ہوسکتا ہے کہ جس کے سامنے اُس کا بُرا عمل خوب صورت بنا کر پیش کر دیا گیا ہے؟) ایسے آدمی کے ایمان کی کیفیت علیٰ وَجہ البصیرت ہوتی ہے۔ محض تقلیدی ایمان نہیں ہوتا۔

اس فائدے کی وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے ایک مثال بھی دی ہے کہ کسی آدمی کو کسی سچے آدمی نے خبر دی کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ پھر اُس نے اُس خبر کی علمی طور پر تصدیق کی اور اُسے سمجھا۔ چناں چہ اُسے قرائن سے معلوم ہوا کہ زہر میں گرمی اور خشکی حد سے زیادہ ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں انسان کے مزاج سے قطعی طور پر متصادم ہیں۔ پھر اپنے تجربے سے اُس خبر کی صداقت پر اُسے مزید پختہ یقین اور ایمان حاصل ہوگیا۔ بالکل اسی طرح علم اسرارِ دین حاصل کرنے والے کو شریعت کے احکامات کا اسی طرح مزید پختہ یقین حاصل ہوجاتا ہے۔ اس علم کے یہ تین بنیادی فائدے ہیں۔

بِرّ و اِثم اور سیاستِ مِلیہ؛ تمام شرائع اور قوانین میں دو بنیادی مباحث

شاہ صاحبؒ نے علم اسرارِ دین کی تعریف، موضوع اور غرض و غایت کے بعد اس علم پر مشتمل کتاب ''حُجّۃُ اللّٰہِ البالِغہ'' کے مباحث کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''ثمّ إنّی جعلتُ الکتابَ علٰی قِسمَین: أحدهما قسم القواعد الکُلِّیة الّتی تنتظم بها المصالح المرعیة فی الشّرائع... و القسم الثّانی فی شرح أسرار الأحادیث من أبواب الإیمان ..... ثمّ من أبواب آداب المعیشة، ثمّ من أبواب شتّٰی. [16]

(میں نے اس کتاب کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ان میں سے ایک قسم ان قواعدِ کلیہ پر مشتمل ہے جو اُن تمام مصلحتوں اور حکمتوں کو منظّم اور مربوط طور پر بیان کرتی ہیں، جنھیں مختلف شریعتوں اور قوانین میں پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ... دوسری قسم (ان قواعدِ کلیہ کی روشنی میں) ابواب الایمان سے لے کر ابواب المعیشت اور چند دیگر ابواب سے متعلق احادیث کے اسرار و رموز کی شرح بیان کی گئی ہے۔)

اس طرح شاہ صاحبؒ نے انسانی سماج اور اس کو درپیش مسائل کے حل کے سلسلے میں تمام مذاہبِ عالم اور ملتوں کے تسلیم شدہ قواعدِ کلیہ پر مشتمل ایک مکمل اور مربوط نظامِ فکر و عمل پیش کیا ہے۔ پھر ان تسلیم شدہ قواعدِ کلیہ کے حوالے سے پہلی قسم میں دو بنیادی بحثیں کی ہیں۔ اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''و رأیتُ أنّ تفاصیلَ أسرارِ الشّرائع ترجِعُ إلٰی أصلینِ: مبحثُ البِرّ و الإثم، و مبحث السّیاسات الملّیة.'' [17]

(میں نے دیکھا کہ سب شریعتوں کے اَسرار و رموز کی تمام تر تفصیلات دو بنیادی اصولوں پر مشتمل ہیں:

(۱) بِرّ و اِثم (نیکی اور بدی) کی بحث (۲) سیاسیاتِ ملیہ کی بحث۔)

دیکھئے! شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جب دنیا بھر کی تمام شریعتوں، قوانین اور دنیا بھر کی تمام ملتوں کے قانونی، سیاسی، سماجی اور معاشی نظاموں کا جائزہ لیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان تمام کی بنیاد دو مباحث ہیں۔

1۔ برّ و اِثم کی بحث

ایک یہ کہ دنیا کا ہر قانون سب سے پہلے یہ بحث کرتا ہے کہ کون سی چیز اُس کے نقطۂ نظر سے ''البِرّ'' یعنی نیکی اور اچھائی ہے؟ اور کون سی چیز ''الإثـم'' یعنی برائی ہے؟ ہر قانون اور مذہب انسانی معاشرے کے لیے جب کوئی نظام بناتا ہے تو جسے وہ نیکی خیال کرتا ہے، اس کو عمل میں لانے کے احکامات جاری کرتا ہے۔ امر (حکم) انھیں باتوں کا دیا جاتا ہے، جو اس کے مقاصد کے مطابق ہو۔ جو عمل اس کے خیال میں بُرا ہوتا ہے، اس سے روکتا ہے، اُسے الاثم یا بُرائی کہا جاتا ہے۔ دنیا کا ہر قانون حکم بھی دیتا ہے اور کچھ چیزوں سے روکتا بھی ہے۔

یہ بحث اس لیے ضروری ہے کہ تمام مذاہب اور فلسفہ ہائے فکر کے لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے جس چیز کا حکم دیا ہے، نیکی صرف وہی ہے۔ اور ہم جس چیز سے روک رہے ہیں، بدی وہی ہے۔ اس کے نتیجے میں مذاہب اور افکار میں اختلافات پیدا ہوئے۔ لہٰذا تمام مذاہب اور افکار کے درمیان پیدا شدہ اختلاف کے حل کرنے کے لیے نیکی کے معیارات طے کرنے ضروری ہیں۔ اس کے لیے پہلے زیرِ بحث عمل کی حقیقتِ واقعیہ کو تلاش کرنا ہوگا۔ تاکہ متعین کیا جائے کہ واقعتاً یہ چیز انسانوں کے لیے اچھی اور مفید ہے تو اس کا حکم دیا جائے۔ اسی طرح واقع کے تعین سے ہی پتہ چلے گا کہ فلاں چیز انسانوں کے لیے مضر ہے، اس کو روک دینا چاہیے۔ کیوں کہ اصل مقصد تو حضرت انسان کو کامیاب بنانا ہے۔ انسانیت کے لیے جو مفید ہوگا، وہ البر (نیکی) اور جو انسانیت کے لیے مضر ہوگا، وہ الاثم (برائی)۔ تو پہلی بحث البر والاثم کی کرنا ضروری ہے۔

2۔ ملّی سیاست کی بحث

دوسری بحث یہ ہے کہ جب کوئی بھی قانون اور ضابطہ کسی چیز کے بارے میں یہ طے کر لیتا ہے کہ وہ اچھی ہے، سوسائٹی میں اس کو فروغ دینا چاہیے اور فلاں چیز بُری ہے، اس کو سوسائٹی سے روک دینا چاہیے۔ یعنی کسی نظام میں کوئی چیز ''معروف'' ہے اور دوسری چیز ''منکر'' ہے۔ ان معروفات اور منکرات یا اوامر اور نواہی یا اچھائی اور بدی کے قیام یا انسداد کا ایک عملی سیاسی نظام قائم کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے ''السّیـاسة الـمِلّیه'' یعنی ملت اور قانون کے سیاسی نظام قائم کرنے کی بحث کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ سیاسی نظام قائم کیے بغیر کوئی نیکی اور بدی پورے طور پر نتائج نہیں دیتی۔ وہ صرف اَخلاقی وعظ ہوسکتا ہے کہ جس کا جی چاہے مانے اور جس کا جی چاہے نہ مانے۔ جب نیکی اور بدی کا تعین ہوگیا تو نیکی اور بدی کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک سیاسی سسٹم کی ضرورت ہے۔ سیاست کہتے ہی اس کو ہیں کہ کسی معاشرے کو نقص سے نکال کر کمال تک پہنچانا اور کمزوریوں کو دور کر کے ترقی کی طرف لے جانا، یہی لفظِ سیاست کا مطلب ہے۔

آج ہمارے ہاں تو لفظِ سیاست بدنام ہوگیا۔ جھوٹ بولنے، دھوکا دینے کو ہم کہتے ہیں کہ یہ سیاسی بات ہے۔ یہ سیاسی وعدہ

www.rahimia.org

تھا، حالاں کہ یہ سیاست نہیں ہے۔ سیاستِ نبویہ یا حقیقی سیاست دراصل قوموں اور ملکوں کو نقص سے نکال کر کمال تک پہنچانے کا عمل ہے۔ گویا طے کردہ قوانین اور ضابطوں کا عملی نظام بنایا جائے۔ آپ نے نیکی اور بدی کے جو اصول متعین کر لیے، اس کی روشنی میں آپ کو کچھ پالیسیاں بنانی ہوں گی۔ اس کے پروسیجرز طے کرنے ہوں گے۔ عمل درآمد کی حکمتِ عملی اور طریقۂ کار بتلانا ہوگا کہ کون سا کام کس وقت پر کس طریقے، کس منہج اور کس نظم کے تحت کیا جانا ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ نیکی تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اسی طرح جو بدی ختم کرنی ہے تو اس بدی کو ختم کرنے کا بھی ایک پروسیجر ہوگا۔ ایک طریقۂ کار ہوگا۔ یہ نہیں کہ جس کا جی چاہے، اپنے خیال کے مطابق کسی چیز کو بدی سمجھے اور اس بدی کو مٹانے کے لیے از خود ہی فیصلے کرنے لگے، کہ میں بدی مٹا رہا ہوں۔ اس کا بھی ایک طے شدہ طریقۂ کار ضروری ہے۔

الغرض! شاہ صاحبؒ نے علم اسرارِ دین کا بنیادی خاکہ بتلاتے ہوئے اس حقیقت کو واضح کیا کہ ہر قانون اور شریعت میں ایک بحث نیکی اور بدی کی حقیقت کو متعین کرنا ہے۔ اور دوسری بحث نیکی کو غالب کرنے اور بدی کو ختم یا مغلوب کرنے کا سیاسی نظام بنانا ہے۔

نیکی اور بدی کو سمجھنے کے لیے چند ضروری مباحث

جب ہم نیکی اور بدی کو واضح کریں گے تو دنیا کا ہر مذہب یا ہر فرد یہ کہے گا کہ ہم نے جس چیز کو اپنے علم سے درست سمجھا ہے، وہی واقعی حقیقت ہے اور وہی درست ہے۔ تو اس کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ حقائق کے تناظر میں واقعتاً کون سی نیکی ہے اور کون سی بدی ہے؟ اس کا تعین کرنے کے لیے کم از کم تین بنیادی بحثیں کرنا ضروری ہے۔

الف: انسانی اعمال کی جزا و سزا سے متعلق بحث

ایک بحث یہ ہے کہ انسانی اعمال کی اچھائی یا بُرائی کو جزا یا سزا کے تناظر میں معلوم کیا جائے۔ اس لیے کہ جس عمل پر سزا ہے، اُس سے روکا جائے گا۔ اس سزا اور عمل کے درمیان تعلق کو سمجھا جانا ضروری ہے۔ ایسے ہی جس عمل کے نتائج انعام کی صورت میں ظاہر ہو رہے ہوں، وہ عمل درست اور نیکی ہے۔ اس عمل اور اس کے اچھے نتیجے کی حقیقت جاننا ضروری ہے۔ اس طرح نیکی اور بدی معلوم کرنے کے لیے مجازات کا قانون جاننا ضروری ہے۔

ب: نوعِ انسانی کی حقیقی کامیابی کی نوعیت سے متعلق بحث

دوسری اہم ترین بحث یہ بھی ہے کہ نوعِ انسانی کی کامیابی کا اصل معیار کیا ہے؟ کیوں کہ تمام قوانین اور شریعتوں کا بنیادی ہدف انسانی سعادت اور کامیابی ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں ترقی کرے۔ خود انسان کی کامیابی اور سعادت کیا ہے؟ کامیابی کی حقیقی اور واقعی تعریف کیا ہے؟ پہلے سعادت اور کامیابی کے تعین کی بحث کرنا ضروری ہے۔

ج: انسانی زندگی میں ارتفاقات کی حقیقت اور اہمیت

تیسری بحث یہ ہے کہ انسان کا یہ جسم گوشت پوست کا بنا ہوا ہے۔ اس میں حیوانی تقاضے ہیں۔ اس کو اپنے جسم کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے سیاسی و معاشی حوالے سے سہولتیں درکار ہیں۔ چناں چہ انسانیت میں اب تک جو سماجی ارتقا اور انسانی سہولتوں کا

www.rahimia.org

نظام وجود میں آیا ہے، اس سے بحث کرنا بھی ضروری ہے۔ ان کو شاہ صاحبؒ نے ''ارتفاقات'' سے تعبیر کیا ہے۔ ارتفاقات کا مطلب ہے انسانوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانا اور سہولتوں کا وجود پذیر ہونا۔

اس طرح بِرّ و اِثم یعنی نیکی اور بدی کی حقیقت و واقعیت معلوم کرنے کے لیے تین بحثیں ضروری ہیں:

1۔ جزا و سزا کا نظام کیا ہے؟　2۔ نوعِ انسانی کی سعادت کیا ہے؟　3۔ ارتفاقات کیا ہیں؟

کائنات اور اس میں جاری کمالاتِ الٰہیہ کی حقیقی نوعیت پر بحث

حضرت شاہ صاحبؒ واضح کرتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی کامیابی کا معیار، انسانی جسم کے ارتفاقات اور انسانی اعمال پر جزا و سزا کا نظام اس وقت تک حقیقی طور پر معلوم نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کائنات کی بنیادی حقیقت اور اس میں جاری اللہ کے بنیادی کمالات کی نوعیت معلوم نہ ہو۔ پھر اس کائنات میں نوعِ انسان کی اصل حقیقت، اس کی تعریف معلوم کرنا ضروری ہے۔ نیز نوعِ انسان کی کیا ضرورتیں ہیں کہ جن کی تکمیل سعادت ہے، ورنہ شقاوت اور انسان کے لیے بُرا ہے۔ اسی طرح انسان کے حقیقی تقاضے معلوم ہونے سے ہی ارتفاقات یعنی سیاست اور معیشت کے معیارات اور کامیابی کے مطلوبہ اَخلاق معلوم ہوں گے۔ اسی بنیاد پر اعمال اور ان کی جزا و سزا کے درمیان موجود ربط (link) کو صحیح طور پر تلاش کر پائیں گے۔ یہ چار بحثیں یعنی کائنات اور انسان کی حقیقت، جزا و سزا کا قانون، ارتفاقات کی نوعیت اور کامیابی کے بنیادی اَخلاق پہلے ہوں گے تو پھر پانچویں بحث ''مبحث البر والاثم'' یعنی نیکی اور بدی کا صحیح معیاری نظام معلوم ہوگا۔ اور جب نیکی اور بدی کی حقیقت واضح ہوگی تو پھر عملی سیاسی، سماجی اور معاشی نظام قائم کرنے کی چھٹی بحث ''مبحثُ السّیاسة المِلّیه'' سمجھ میں آئے گی۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ کے بیان کردہ دین کے بنیادی اساسی اصول پر مشتمل ساتویں بحث سمجھ میں آئے گی۔ اس طرح ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کی پہلی قسم سات مباحث پر مشتمل ہے۔ چھ تو مذکورہ بنیادی مباحث ہیں اور ساتواں مبحث اس کا خلاصہ اور تتمہ ہے یعنی ان مسلمہ اصولوں کی روشنی میں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی احادیث سے اخذ کردہ نیکی، بدی اور سیاسی نظام کی حقیقت جاننا۔ اس کتاب کی دوسری قسم میں ''کتاب الإیمان'' سے شروع کر کے آخری ''باب سیر النبی ﷺ'' تک کے تمام ابواب میں پہلی قسم میں متعین کیے ہوئے قواعد وضوابط کی روشنی میں حضورؐ سے مروی احادیث و روایات کے اَسرار و رموز اور حکمتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ علم اسرارِ دین کی مباحث کا ایک اجمالی خاکہ ہے۔

حقیقتِ واقعیہ کے تعین کے مُسلّمہ قواعدِ کُلّیہ

شاہ صاحبؒ نے علمِ اسرارِ دین کی پہلی قسم میں قواعدِ کلیہ بیان کیے ہیں۔ یہ تمام اصول اور قواعد قرآن حکیم کے نزول کے زمانے میں موجود تمام مذاہب، ملتوں اور فلسفوں کے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔ چند مجنون اور بے وقوف افراد کو چھوڑ کر جمہور انسانوں کے نزدیک یہی قواعد وضوابط مسلمہ تھے۔ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''و أکثرها کانت مسلّمةً بین المِلل الموجودة فی عهد النّبیّ ﷺ و لم یکن فیها اختلاف بینهم، و کان الحاضرون مستغنین عن سوالها، فنبّه النّبیّ ﷺ علیها کما یُنبّه علی الأصول المفروغ عنها، عند إفادة الفروع، فتمکّن السّامعون من إرجاع الفروع إلیها لما مارسوا من

نظائرها فی العرب المنتسبین إلٰی الملّة الإسماعیلیة، و الیهود، و النّصاریٰ، و المجوس.'' [18]

(ان قواعدِ کلیہ میں اکثر وہ ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں موجود تمام ملتوں کے درمیان تسلیم شدہ ہیں۔ وہاں حاضر لوگوں کو ان قواعدِ کلیہ کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چناں چہ نبی اکرمؐ نے ان اصولوں پر کچھ اس انداز سے متنبہ فرمایا جیسے طے شدہ اصولوں کی بنیاد پر فروعات اور ذیلی قوانین بنائے جاتے ہیں۔ پس حضورؐ کے سامعین ان قواعدِ کلیہ کے تحت ذیلی اور ضمنی قوانین کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس لیے کہ ملتِ اسماعیلیہ، یہود و نصاریٰ (ملتِ اسرائیلیہ) اور ملتِ مجوس (صائبین) کو ماننے والے عرب ان مسائل کے ملتے جلتے نظائر سے مانوس تھے۔)

شاہ صاحبؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰـهِ الْبَـالِغَـه'' کے ابتدائی مباحث میں دینِ اسلام اور دیگر مذاہب کی روشنی میں ان ''واقعی مسلمات اور قواعدِ کلیہ'' کا تعین کیا ہے، تاکہ تجزیہ کرنا آسان ہوجائے کہ ''مشائین'' یعنی جو عقل کی بنیاد پر باتیں کر رہے ہیں، انھوں نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے؟ ''متاخرین صوفیا'' جو صرف کشف کی اساس پر بات کر رہے ہیں، ان سے کہاں غلطی ہوئی؟ ''فقہا اور محدثین'' جو صرف نقل کی بنیاد پر بے شمار فقہی جزئیات اور روایات کی حیثیت متعین کیے بغیر نقل در نقل کرتے آرہے ہیں، ان کا بھی پتہ چل جائے گا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں؟ اسی طرح ''متکلمین'' نے کس جگہ ٹھوکر کھائی؟ اور ''اشراقیین'' کو کہاں غلطی لگی؟

اس طرح مسلمہ قواعد دریافت کرنے سے آج تک کے تمام افکار و خیالات کا بھی تجزیہ کرنا آسان ہوگیا۔ چناں چہ آج کا یورپ مشائیہ کے نقش قدم پر ہے۔ سوشلزم ہو یا کیپٹل اِزم، ان دونوں کی بنیاد بھی اُسی مادی فلسفے پر ہے۔ لہٰذا اگر شاہ صاحبؒ کا علمِ اَسرارِ دین ہمیں وضاحت سے سمجھ میں آجاتا ہے تو آج کے دور میں فلسفے کے تمام مکاتبِ فکر کا تحلیل و تجزیہ کرنا بھی ایک مسلمان عالم کے لیے آسان ہوجاتا ہے۔

علمِ کمالاتِ اربعہ اور کائنات کی حقیقت

سب سے پہلے شاہ صاحبؒ نے کائنات کی حقیقت سے متعلق چند بنیادی اساسی امور واضح کیے ہیں۔ اس کائنات میں کمالاتِ الٰہیہ جاری ہیں، جو تمام مذاہب اور تمام فلسفوں میں تعبیرات کے اختلاف کے باوجود متفق علیہ ہیں۔ کسی نے ایک انداز سے تعبیر کیا ہے، کسی نے دوسری طرح سے تعبیر کیا ہے۔ ان تعبیرات کے اختلافات کو شاہ صاحبؒ ''حُجّةُ اللّٰـه البالِغه'' میں زیرِ بحث نہیں لائے ہیں، بلکہ اس بحث کو اپنی دیگر کتابوں جیسے **''لمحات''**، **''سطعات''**، **''البدور البازغه''** اور **''التّفهیمات الإلٰهیه''** وغیرہ میں لائے ہیں، وہاں **''مشّائین''** اور **''اشراقیّین''** وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ کہیں کہیں شاہ صاحبؒ **''متکلِّمین''** کے اقوال بیان کرکے رَد بھی کرتے ہیں۔ بعض اوقات **''حُجّةُ اللّٰه البالِغه''** کو سمجھنا اس لیے مشکل ہوجاتا ہے کہ شاہ صاحبؒ کی دیگر کتابوں کا اس کے ساتھ جو ربط (Link) ہے، وہ مطالعہ کرنے والوں کے سامنے نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب کہتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں جو مسلمہ قاعدے اور ضابطے ہیں، وہ کمالاتِ اربعہ کہلاتے ہیں:

1۔ إبداع (بغیر کسی مادے کے کائنات کا مادہ وجود میں لانا)

پہلی حقیقت ـــــ جس پر سب انسانوں کا اتفاق ہے ـــــ یہ ہے کہ اللہ نے بغیر کسی مادے کے کائنات کا مادہ پیدا کیا ہے۔ ہر ایک مکتبِ فکر نے اپنے دائرۂ فکر کے مطابق اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس کمال کو ''إبــداع'' سے

تعبیر کیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ''بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط ''(19) (اللہ تبارک وتعالیٰ آسمانوں اور زمینوں کو نئی طرح پر بنانے والا ہے۔) شاہ صاحبؒ نے اِبداع کی تعریف یہ کی ہے:

''أحدها: الإبداع و هو إيجاد شيء لا من شيء؛ فيخرج الشّيء من كتم العدم بغير مادّة. و سُئل رسول اللّٰه ﷺ عن أوّل هٰذا الأمر، فقال: "كان اللّٰه و لم يكن شيء قبلهٗ.(20)''(21)

(کائنات کی تخلیق کو وجود بخشنے کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت ''اِبداع'' ہے۔ وہ کسی چیز کو بغیر کسی چیز کے وجود بخشنا ہے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی مادے کے کسی چیز کو پردۂ عدم سے نکالا۔ رسول اللہ ﷺ سے اس کائنات کے آغاز سے متعلق سوال کیا گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''اللہ تبارک وتعالیٰ موجود تھا اور اس سے پہلے کوئی چیز وجود نہیں رکھتی تھی۔'')

آیاتِ قرآنی اور احادیثِ نبویہؐ سے معلوم ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے اس کمالِ الٰہی سے اس کرۂ ارض، پورے نظامِ شمسی اور پوری کائنات؛ عرش سے لے کر فرش تک سب سے پہلے تمام مخلوق کے مادے کو وجود بخشا۔

شاہ صاحبؒ ''التّفهيمات الإلٰهيه'' میں ابداع کی حقیقت اور اس سے سب سے پہلے پیدا ہونے والی ایجادات کی نوعیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سألتموني عن الإبداع ما هو؟ فأقول: هو إيجاد شيء من غير مادةٍ، و أوّل المبدعات: (۱) القلم (۲) ثمّ اللّوح (۳) ثمّ العرش (۴) و الماء المشار إليه بقولهٖ تعالیٰ: "وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ"(22) ثمّ خلق اللّٰه تعالىٰ من الماء ما خلق و من هنالك بدء الخلق.''(23)

(تم نے مجھ سے پوچھا ہے کہ ابداع کی حقیقت کیا ہے؟ پس میں کہتا ہوں کہ وہ بغیر کسی مادے کے کسی چیز کو پیدا کرنا ہے۔ سب سے پہلے ابداع کے ذریعے سے پیدا ہونے والی چیزیں: (۱) قلم، (۲) پھر لوحِ محفوظ، (۳) پھر عرش، (۴) پھر پانی ہیں۔ انھی کی طرف اللہ تعالیٰ کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ: ''اللہ کا عرش پانی پر ہے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے پانی سے تمام مخلوقات پیدا کی ہیں۔ یہیں سے مخلوقات کی ابتدا ہوئی۔)

2۔ خَلق (مادے سے مخلوقات کو وجود بخشنا)

دوسری بنیادی حقیقت اور کمالِ الٰہی ''خَلق'' ہے کہ اس ابتدائی مادے سے اللہ نے تمام مخلوق پیدا کی۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و الثّانية: الخَلق؛ و هو إيجاد الشّيء من شيء كما خلق آدم من تُراب وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ(24)''(25)

(دوسرا کمالِ الٰہی ''خَلق'' ہے اور وہ کسی چیز سے کسی دوسری چیز کو پیدا کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا (ارشادِ ربانی کے مطابق:) ''اور جن کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا''۔)

خَلق کا مطلب کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ جب بھی ایک چیز دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، تو ان میں کچھ مشترک امور ہوتے ہیں اور کچھ امتیازی امور ہوتے ہیں۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انواع و اجناس اور اقسام پیدا کیں۔ اللہ نے کائنات کے

www.rahimia.org

عناصر پیدا کیے۔ ایک زمانے میں بحث کے لیے یہ متعین کیا گیا تھا کہ یہ عناصر چار ہیں: آگ، پانی، مٹی اور ہوا۔ آج جب مزید تحقیق کے بعد مختلف سائنس دانوں کی رائے کے مطابق عناصر ایک سو نو یا ایک سو سولہ کے قریب ان کی تعداد سامنے آئی۔ اور نہ جانے آئندہ زمانے کے سائنس دان اس سے آگے بڑھ کر کچھ اَور چیزیں دریافت کرلیں۔ اب خواہ جدید تحقیق کے مطابق عناصر کی تعداد لے لو، یا قدیم فلاسفہ یونان کے طے کردہ عناصرِ اربعہ کو لے لو، کوئی سی بھی تعداد متعین کرلو! کیوں کہ کسی علم میں بحث کرنے کے لیے سب سے پہلے کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ماننا پڑتا ہے۔ جیسے آپ سفید کاغذ پر 'پرکار' (compass) سے ایک نقطہ لگاتے ہیں۔ پھر اُس سے پیمائش کرتے ہیں کہ اتنے سے ادھر جائیں اور اتنے سے ادھر جائیں تو ایک مربع یا مستطیل وغیرہ وغیرہ بنا سکتے ہیں، لیکن اگر یہ نقطہ ہل گیا تو سارا ڈھانچہ ہل جائے گا اور علم آگے نہیں بڑھے گا۔ لہٰذا عناصر کے حوالے سے بھی آپ کو قدیم و جدید میں سے کوئی ایک معیار ماننا پڑے گا۔

اب پانی ایک بنیادی عنصر ہے۔ عرشی قوت اور پانی کے باہمی اتصال سے دیگر عناصر وجود میں آئے۔ قرآن پاک میں اللہ کا ارشاد ہے: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط''[26] (اور ہم نے پانی سے ہر زندہ چیز بنائی)۔ پھر ان عناصر کے ذریعے سے پہلے معدنیات بنائے، پھر اگلے مرحلے میں نباتات اُگائے، اس سے اگلے مرحلے میں حیوانات اور اس سے اگلا مرحلہ انسانوں کا ہے۔ تمام فلاسفہ اور حکما کے ہاں یہ چار اجناس اور انواع ہیں۔ اگر فلاسفہ کی زبان میں مزید بحث کی جائے تو وہ جوہر و عرض کی بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اجناس میں پہلے وجود، پھر جوہر، پھر جسمِ مطلق، پھر جسمِ نامی اور پھر جسمِ حیوانی ہے۔ پھر جنسِ حیوان سے آگے نوعِ انسان ہے۔ اس طرح انواع، اجناس اور اس کے اوپر کی اجناس یعنی جنسِ قریب یا جنسِ بعید کی ترتیب ہے۔ کسی زبان میں آپ گفتگو کرلیں تو کم از کم مذکورہ چار دائرے آپ کے سامنے آجائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے اِبداع کے کمال سے مخلوقات کے جس مشترک مادے کو وجود بخشا تھا، تخلیق کے وقت اسی مادے سے مخلوقات میں مابہ الامتیازات (Characteristics) یعنی امتیازی خصوصیات پیدا کیں۔ انھی کی وَجہ سے ہر ایک مخلوق اپنی ایک علاحدہ حقیقت و ماہیت، خواص و تاثیرات رکھتی ہے۔ ہر ایک عنصر (Element) میں ایک خاص نوعیت اور خاصیت رکھی۔ مثلاً آکسیجن کے جو خواص ہیں، وہ ہائیڈروجن اور دوسرے باقی عناصر میں نہیں ہیں۔ ہر ایک عنصر کا اپنا ایک خاص خاصہ ہے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ تخلیق کے وقت کوئی چیز جس خاصے پر پیدا کردی گئی ہے، اس کا وہ خاصہ کبھی نہیں بدلتا۔ ہمیشہ قیامت تک وہی رہے گا۔ تخلیق کے حوالے سے بنیادی حقیقت یہ ہے کہ تخلیق ہمیشہ کسی پہلے سے پیدا شدہ مادے سے ہوتی ہے۔ بغیر مادے کے براہِ راست تخلیق نہیں ہوتی۔ چناں چہ پہلے مادہ بنے گا اور پھر مادے سے تخلیق کا عمل ہوگا۔

3۔ تدبیر (مخلوقات سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کا نظام)

اللہ تعالیٰ کے کمالِ اِبداع کے بعد کمالِ خَلق کے نتیجے میں مخلوقات پیدا ہوئیں۔ ہر ایک مخلوق اپنی ایک جداگانہ خاصیت اور امتیازی شناخت رکھتی تھی۔ اس طرح ایک دوسرے سے مختلف و متضاد اشیا، انواع اور اجناس وجود میں آئیں۔ اس وَجہ سے ان کے درمیان تضادات پیدا ہوئے، جنھیں حل کرنے کے لیے ہر ایک مخلوق کے دائرۂ کار کا متعین نظام بنانا ضروری ٹھہرا۔ اس وقت

اللہ کا ایک تیسرا کمال ظاہر ہوا، جس کو امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ''تدبیر'' سے تعبیر کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و الثّالثة: تدبير عالَم المواليد؛ و مرجعهُ إلٰى تصيير حوادثها موافقةً للنّظام الّذى ترتضيه حكمتهُ، مفضيةً إلٰى المصلحة الّتى اقتضاها جُوده.'' (27)

(اللہ تبارک و تعالیٰ کا تیسرا کمال یہ ہے کہ اُس نے (اجناس و انواع پر مشتمل) عالمِ موالید (معدنیات، نباتات اور حیوانات) کی تدبیر کا ایک نظام قائم کیا ہے۔ اس تدبیر کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کائنات میں وجود میں آنے والے تمام واقعات و حوادث اُس نظام کے موافق ہونے چاہئیں، جسے اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت پسند کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی جود و عطا جس مصلحت کا تقاضا کرتی ہے، وہ پوری ہوجائے۔)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے لیے ایک مربوط نظام قائم کیا ہے۔ ہر ایک مخلوق کا دائرۂ کار متعین کر کے ان کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی۔ اس تدبیر اور نظام کے ذریعے سے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ ان کے درمیان کوئی ایسا ٹکراؤ نہ ہو، جس سے کوئی ایک مخلوق سِرے سے فنا ہوجائے۔ اس لیے کہ ایسا ہونا مقصدِ تخلیق کے خلاف بات ہے۔ جب ہر ایک مخلوق اور اُس کی امتیازی خصوصیت کو باقی رکھنا ضروری ٹھہرا تو ان کے درمیان کسی نہ کسی طریقے سے ہم آہنگی ہونی چاہیے، کوئی تدبیر ہونی چاہیے اور کوئی سسٹم بننا چاہیے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے لیے ایک عالم گیر تدبیری نظام قائم کیا ہے۔

تخلیق اور تدبیر دونوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ... يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ

(اللہ وہ ذات ہے جس نے چھ دنوں میں آسمان و زمین اور اس کے درمیان مخلوقات پیدا کیں اور پھر عرش پر قرار پکڑا۔ ...وہی ذات ہے کہ جس نے آسمان سے لے کر زمین تک کے تمام امور کی تدبیر اور نظام قائم کیا ہے۔) (28)

معلوم ہوا کہ کائنات ایک سسٹم کے تحت چل رہی ہے۔ اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ نے تحریر کیا ہے:

''و تفصيل ذٰلک: أنّ القوى المودعة فى المواليد، الّتى لا تنفکّ عنها، لمّا تزاحمت و تصادمت، أوجبت حكمة اللّٰه حدوث أطوار مختلفة، بعضها جواهر و بعضها أعراض، و الأعراض إمّا أفعال، أو إرادات من ذوات الأنفس، أو غيرهما.'' (29)

(اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام موالید (جمادات، نباتات اور حیوانات) میں رکھی گئی قوتیں کبھی اُن سے جدا نہیں ہوتیں۔ ان میں جب باہم ٹکراؤ اور تصادم ہوا تو اس کے نتیجے میں اللہ تبارک و تعالیٰ کی حکمت نے مختلف کیفیات اور حالات پیدا کیے۔ جن میں بعض جوہر ہیں اور بعض عرض ہیں۔ اور پھر اعراض میں یا افعال ہیں، یا روح رکھنے والی مخلوق میں ارادے اور عزائم وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔)

جب مخلوقات وجود میں آئیں تو ان مخلوقات کے باہم ٹکراؤ سے قوتیں پیدا ہوئیں۔ توانائیاں (energies) بکھریں۔ ان توانائیوں کے درمیان امتیازی خصوصیات کی وَجہ سے تضادات پیدا ہوئے تو انھیں حل کرنے کی ایک تدبیر اور سسٹم بنایا گیا۔ کسی نظام کو قائم کرنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک قوت، ہر ایک فرد اور ہر ایک جماعت ڈسپلن کے تحت اپنے اپنے دائرے میں

www.rahimia.org

رہ کر کام کرے۔ اس حوالے سے وہ محاورہ سامنے رہے کہ ''وہ لاٹھی ضرور گھمائے، لیکن اس کے ذریعے سے کسی دوسرے کی ناک توڑنے کی اجازت نہیں۔'' ڈسپلن میں رہنے کے لیے نظام ضروری ہے۔ اس تدبیر سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے حوالے سے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اقتضت رحمة اللّٰه بعبادهٖ و لُطفهٖ بهم، و عموم قدرتهٖ علٰى الكلّ، و شمول علمهٖ أن يتصرّف في تلك القوىٰ، و الأمور الحاملة لها، بالقبض، و البسط، و الإحالة، و الإلهام، حتّٰى تفضي تلك الجملة إلٰى الأمر المطلوب.'' (30)

(اللہ کی اپنے بندوں پر رحمت، اُن پر مہربانی اور تمام مخلوقات پر اُس کی عمومی قدرت اور اس کے وسیع ترین علم نے تقاضا کیا کہ وہ مخلوقات میں رکھی گئی قوتوں اور اُن قوتوں کو حرکت میں لانے والے امور میں قبض، بسط، احالہ اور الہام کے ذریعے سے تصرف کرے۔ یہاں تک کہ ان تمام کے مجموعی عمل سے اللہ کا مطلوب کام پورا ہو کر رہے۔)

کائنات میں اللہ کی طرف سے جاری کی گئی تدبیر اور نظام سے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے چار طریقے ہیں:

(۱) **قبض** (کنٹرول کرنا) (۲) **بسط** (وسعت اور پھیلاؤ) (۳) **إحاله** (تغیر و تبدل) (۴) **إلهام** (دل میں خیال ڈالنا)

(۱) جب کرۂ ارض پر موجود قوتوں کے درمیان ٹکراؤ ہو اور اس کے نتیجے میں کوئی مخلوق فنا ہونے کے قریب ہو تو کائنات کی مصلحتِ کلیہ اور مخلوقات کی بقا کا نظام تقاضا کرتا ہے کہ اس کو باقی رکھنا ضروری ہے۔ اس موقع پر ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب سے فرشتوں کے ذریعے اس مخلوق کو انرجی اور طاقت سپلائی کی جاتی ہے، اس کو ''بسط'' کہتے ہیں۔

(۲) جو طاقت چڑھائی کر کے دوسری مخلوق کو فنا کے گھاٹ اتار رہی تھی تو قوتوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کے لیے منہ زور قوتوں کو کنٹرول میں لایا جاتا ہے، اس کو ''قبض'' کہتے ہیں۔

(۳) اگر ان دونوں طریقوں سے کام نہیں بن رہا تو دونوں قوتوں کے ٹکراؤ کے نتیجے میں وہ مادہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل (Convert) ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کائنات مادے اور عناصر کی بنیاد پر قائم ہے۔ ہم نہ مادے کو پیدا کر سکتے ہیں اور نہ ہی فنا کر سکتے ہیں، البتہ مادہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کو شاہ صاحبؒ کی اصطلاح میں ''احاله'' کہا جاتا ہے۔

(۴) اگر جان داروں کا معاملہ ہے تو جان داروں میں ایک چوتھا عمل یہ ہوتا ہے، ان کے دلوں میں خیال ڈال کر دوسرے کے ظلم سے بچنے، یا اپنی قوت کو بڑھانے کا طریقہ بتلایا جاتا ہے، اس کو ''اِلهام'' کہا جاتا ہے۔

اس طرح اس پوری کائنات میں عالم گیر تدبیر اور نظام ان مذکورہ بالا چار امور کے ذریعے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تدبیر کی ان چاروں اقسام اور ان کی مثالوں کو خوب اچھی طرح بیان کیا ہے۔

4۔ عالمِ مثال اور تجلیات کا عالم گیر نظام

کمالاتِ الٰہیہ میں سے چوتھا کمال یہ ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس کائنات میں ''عالمِ ارواح'' اور ''عالمِ ارضی'' کے درمیان ایک غیر مادی اور غیر عنصری عالَم تخلیق کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اسے پورے دلائل سے ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

www.rahimia.org

''إعلم! أنّه دلّت أحاديث كثيرة علىٰ أنّ في الوجود عالَماً غير عنصريّ، تتمثّل فيه المعاني بأجسام مناسبة لها في الصّفة، و تحقّق هنالک الأشياء قبل وجودها في الأرض نحواً من التّحقّق، فإذا وُجدت كانت هي هي، بمعنى من معاني هو هو؛ و أنّ كثيراً من الأشياء ممّا لا جسم لها عند العامّة، تنتقل و تنزل و لا يراها جميع النّاس.'' (31)

(جاننا چاہیے کہ بہت سی احادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں اس کائنات کے وجود میں ایک ایسا غیرعنصری (غیرمادی) عالَم ہے کہ جس میں (دنیا میں وجود میں آنے والی اشیا کے) معانی اپنی وصفی مناسبت کے ساتھ مثالی اجسام رکھتے ہیں۔ اس طرح وہ اشیا زمین پر اپنے وجود سے پہلے کسی نہ کسی صورت میں اُس غیرمادی عالَم میں وجود پذیر ہوتی ہیں۔ زمین پر اُن اشیا کا وجود اسی شکل وصورت میں ہوتا ہے، جو اُس عالَمِ مثال میں موجود تھے۔ اسی طرح احادیث سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ عام لوگوں کے نزدیک کوئی جسم نہ رکھنے والی ایسی بہت سی اشیا ہیں، جو نیچے سے اوپر منتقل ہوتی ہیں اوراوپر سے نیچے اُترتی ہیں۔ انھیں تمام لوگ نہیں دیکھ پاتے۔)

اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات پر مبنی تجلیات کے ذریعے سے ہی کائنات کا نظام چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات عالمِ ارواح سے اس کرۂ ارض پر عالمِ مثال کے واسطے سے آتے ہیں۔ قرآنی نصوص سے یہ بات واضح ہے کہ اللہ کی جانب سے کائنات میں جاری تمام اعمال فرشتوں کے ذریعے سے ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ٹھہرا۔ اسے ''آمنتُ باللّٰه و ملائكته'' (میں اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر ایمان لایا) کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔ عالمِ مثال میں اللہ کے احکامات وتجلیات کو لانے لے جانے کا کام ملائکہ کرتے ہیں۔ وہ کائنات کا نظم ونسق چلانے والی ایسی اتھارٹی ہے کہ جن کے بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

لَّا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَآ أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۝ (32)

(انھیں جو حکم دیا جاتا ہے، اس میں نافرمانی نہیں کرتے ہیں اور جس کا حکم دیا جاتا ہے، وہی کرتے ہیں۔)

''عالمِ مثال'' فرشتوں کے اس نظام پر مشتمل ہے۔ اس عالَم کو ثابت کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' میں بیسیوں احادیث نقل کی ہیں۔ انھوں نے کتاب وسنت سے یہ بات ثابت کی ہے کہ کائنات کے اس عالَم میں اس کرۂ ارض پر آنے سے پہلے تمام چیزوں کا غیرمادی ماڈل تیار ہوتا ہے اور اسی ماڈل کے مطابق دنیا میں وہ عمل ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ نے یہ حقیقت اپنی وقیع کتاب ''عبقات'' میں واضح کی ہے کہ جو آدمی عالم مثال کو نہیں مانتا، وہ قرآن وسنت کی ایک ہزار سے زیادہ آیات واحادیث کی صحیح تعبیر اور تشریح نہیں کرسکتا، بلکہ اسے ان کا انکار کرنا پڑے گا۔ وہ لکھتے ہیں:

''الجاحد للوُجود المثالي ليس من أهل السّنّة حقّاً، بل فيه شوب من الاعتزال لما أنّهٗ يضطرّ إلىٰ ألف نصّ بل أكثر تاويلاً بعيداً.'' (33)

(حق بات یہ ہے کہ عالمِ مثال کا انکار کرنے والا اہلِ سنت میں سے نہیں ہے، بلکہ اُس میں معتزلہ کے خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اُسے ایک ہزار بلکہ اُس سے بھی زائد نصوصِ شرعیہ کی تاویلِ بعید کرنی پڑے گی۔)

اس عالمِ ارضی میں انسان کی آمد سے پہلے اس کا وجود عالمِ مثال میں ہی تخلیق ہوا تھا۔ چناں چہ حدیث میں ہے کہ:

''إن اللّٰہ خلق آدم، ثم مسح ظھرہٗ بیمینہٖ فاستخرج منہٗ ذُرّیۃً.'' [34] (اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، پھر ان کی پشت پر اپنا داہنا ہاتھ پھیرا تو ان کی تمام اولاد کو ان کی پشت سے نکالا۔)

پھر وہیں اُن تمام سے اللہ نے پوچھا تھا: ''أ لستُ بربّکم'' (کیا میں تمھارا ربّ نہیں ہوں؟) انھوں نے کہا تھا: ''بلیٰ!'' (کیوں نہیں؟) حضوؐر نے معراج میں عالم مثال میں ہی انسانوں کے نسمے حضرت آدم علیہ السلام کے اردگرد دیکھے تھے۔ حدیث میں ہے:

''ھٰذا آدم، و ھٰذہٖ الأسودۃ عن یمینہٖ و شِمالہٖ نسمُ بنیہ.'' [35]

(یہ آدم ہیں اور یہ اُن کے دائیں بائیں موجود لوگ ان کی اولاد کے نسمے ہیں۔)

انسانیت کے تمام نسمے عالمِ مثال میں ہی وجود پذیر ہوئے۔ پھر انسان کی روح لے کر فرشتہ اوپر سے نیچے رحم مادر میں آتا ہے۔ اس طرح انسان کی روح عالم ارواح اور عالم مثال سے ہوتی ہوئی آتی ہے۔ یہاں اس دنیا میں موجود انسانی وجود اور اعمال عالم مثال میں موجود انسان کے ہم مثل ہوتے ہیں۔ یعنی جیسا روح کا مثالی جسم وہاں ہوتا ہے، ویسے ہی اس دنیا میں اس کی جسمانی ساخت بنتی ہے۔ عالم مثال میں اعمال کی جو مثالی شکل ہوتی ہے، اسی طرح وہ اعمال دنیا میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔ یہ صرف انسان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ یہاں جتنی بھی مخلوقات وجود میں آئی ہیں، وہ عالم مثال میں موجود اپنے اصل نمونے اور ہم مثل کے مطابق ہوتی ہیں۔

پھر شاہ صاحبؒ عالم مثال کے بھی دو طبقے بیان کرتے ہیں:

1۔ ایک بالائی، جو عرشِ الٰہی اور عالمِ ارواح کے قریب ہوتا ہے، جسے ''ملاءِ أعلیٰ'' کہا جاتا ہے۔

2۔ دوسرا طبقۂ زیریں، جو نظامِ شمسی اور زمین کے اردگرد کام کرتا ہے، جسے ''ملاءِ سافل'' کہا جاتا ہے۔

ملاءِ اعلیٰ کی اصطلاح قرآن حکیم میں بھی ہے: مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ۝ [36] (مجھے کچھ معلوم نہیں کہ ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے کس چیز میں آپس میں تکرار کرتے ہیں۔) شاہ صاحبؒ نے ملاءِ اعلیٰ کے بھی تین طبقات بیان کیے ہیں۔

اس طرح ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل پر مشتمل فرشتوں کا ایک مربوط نظام کائنات میں عرش سے فرش تک جاری و ساری ہے۔ یہ اس کائنات میں اللہ کے کمالات میں سے چوتھا اہم ترین کمال ہے۔

اس طرح اللہ کے چار کمالات؛ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی یا تجلی کی اساس پر اس کائنات کا عالم گیر نظام جاری ہے۔

شاہ صاحبؒ نے اپنی کتاب ''لمحات'' میں ان چاروں کمالات کو ایک نئے عقلی انداز اور فلسفیانہ اُسلوب میں بیان کیا ہے۔ وہاں عالمِ مثال پر مشتمل فرشتوں کے نظام کو صوفیا کی اصطلاح ''تدلّی'' سے تعبیر کیا ہے:

''أفعال الحقّ تبارک و تعالیٰ و إن کانت کثیرۃ جدّا، فإنّھا لا تخرج عن أربعۃ أجناس:

[۱] إبداع [۲] و خلق [۳] و تدبیر [٤] و تدلّی.

[۱] فالإبداع: إفاضۃ الشّیء من العدم البحت إلیٰ التّحقّق.... [۲] و الخَلق: جعل الشّیء شیئاً... و الأثر المرتّب علیہ: ظھور الأفلاک، و العناصر، و سائر الأنواع بخواصھا و آثارھا.

... [٣] و أمّا التّدبير: فالتّصريف فی العالَم، ليصير الحوادث فيه موافقةً للمصلحة الكلّية. ...
والمحوّج إليه: امتزاج القویٰ بالقویٰ، لو لم يكن التّدبير أفضی إلیٰ الشّرّ الواجب فی حكمة اللّٰه تعالٰی نفيه. و مرجعه: إلیٰ إلهام ذات الإرادة من الملائكة، و النّاس، و البهائم، و إلیٰ إحالة طبائع المواليد، و إلیٰ تقريبات مركّبة من القبيلتين. ... [٤] و أمّا التدلّی: فأصله ظهور الحقّ فی العالَم، مدبّراً له بمنزلة تدبير النّفس النّاطقة لجسده. و يتفرّع عليه ظهور عكس هٰذا التّجلّی فی الرّؤيا، أو اليقظة، أو فی المعاد. ... و الأثر المرتّب عليه: ظهور علمٍ و رُشدٍ، أو تكميل النّفوس. ... و لا يتمّ يومئذ إلاّ بالتدلّی. ''(37)

(اللہ تبارک وتعالیٰ کے افعال اگر چہ بہت زیادہ ہیں، لیکن وہ تمام چار بنیادی اجناس اور کمالات کے دائرے سے باہر نہیں ہیں: (١) ابداع (٢) وخلق (٣) وتدبیر (۴) وتدلّی۔ پہلا ابداع ہے اور وہ کسی شئے کو عدمِ بحت سے وجود کی طرف لانا ہے۔ ...دوسرا کمال ''خلق'' ہے اور یہ کسی ایک شئے کو دوسری شئے سے تخلیق کرنا ہے۔ ...اس کا اثر یہ مرتب ہوا کہ کائنات میں افلاک، عناصر اور تمام انواع اپنے خواص وآثار کے ساتھ ظاہر ہوئے۔ تیسرا کمال ''تدبیر'' ہے۔ کائنات میں اشیا کے تغیر وتبدل کا ایسا طریقہ کار اختیار کرنا کہ یہاں پیدا ہونے والے حوادث و واقعات مصلحتِ کلیہ کے مطابق وجود میں آئیں۔ ...اس میں چند قوتوں کا دوسری قوتوں کے ساتھ امتزاج پیدا کیا جاتا ہے۔ اگر کائنات میں، یہ تدبیری نظام نہ ہوتو ایسا شر پیدا ہوجاتا ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ کی حکمت کی نفی ہوتی ہے۔

اس تدبیر کے ذریعے سے کائنات میں ارادہ رکھنے والی مخلوق؛ فرشتے، لوگ اور جان داروں میں ''الہام'' کیا جاتا ہے۔ نباتات، جمادات اور حیوانوں کی طبیعتوں میں تغیر وتبدل اور ''اِحالہ'' کیا جاتا ہے۔ اور الہام اور احالہ سے مرکب ''قبض'' و ''بسط'' پر مبنی تقریبات وجود میں لائی جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا چوتھا کمال ''تدلّی'' ہے، جس کی اصل بنیاد حق تبارک وتعالیٰ کی تجلی کا اس عالَم میں ظہور ہے۔ یہ اس کائنات کے تدبیری نظام کو ایسے ہی قائم رکھے ہوئے ہے، جیسا کہ انسانی جسم میں اس کی روح اور نفس ناطقہ کا کردار ہوتا ہے۔ اسی تجلی کا عکس خواب میں یا جاگنے میں یا آخرت میں ظاہر ہوگا۔ ...اس تجلی کے ذریعے سے اس دنیا میں علم و ہدایت ظاہر ہوتی ہے اور انسانی نفوس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس تجلی کے بغیر آج کے دن میں کائنات مکمل نہیں ہوتی۔)

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فکر وفلسفے میں ان کمالاتِ الٰہیہ کی بڑی اہمیت ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ اللہ تبارک و تعالیٰ کی بڑی نعمتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ''علمِ کمالاتِ اربعہ'' کے بارے میں اپنی خودنوشت سوانح میں لکھتے ہیں:

''نعمتِ عظمٰی بریں ضعیف آں است ...علمِ کمالاتِ اربعہ، یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی بہ ایں عرض وطول۔ ...
وایں علم جلیل اند کہ پیش ازیں فقیر کسے برگردِ آں نہ گشتہ۔''(38)

(اس بندۂ ضعیف پر اللہ کی جو بڑی نعمتیں ہوئی ہیں، ان میں علم کمالاتِ اربعہ یعنی ابداع، خلق، تدبیر اور تدلّی کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ہے۔ یہ علم ایسا ہے کہ اس فقیر سے پہلے کوئی اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔)

اس لیے شاہ صاحبؒ کے فکر و فلسفے کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ علمِ کمالاتِ اربعۂ الٰہیہ کا ضروری فہم حاصل کیا جائے۔

کائنات میں کارفرما قوتوں کا مرتب نظام

شاہ صاحبؒ نے کائنات میں جاری علمِ کمالاتِ اربعہ کی تفہیم کے بعد اس کائنات میں کارفرما قوتوں کے نظام کی بھی وضاحت کی ہے۔ یہاں موجود ہر قوت کے اپنے کچھ خواص اور اثرات و نتائج ہیں۔ یہ قوتیں اس کائنات میں ایک ترتیب کے ساتھ عالم گیر نظام کے ماتحت کام کر رہی ہیں۔ انسان پر ان تمام قوتوں کے اثرات ایک خاص ترتیب کے ساتھ مرتب ہوتے ہیں۔ عقل و نقل اس حقیقت کی نشان دہی کرتی ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''اِعْلَمْ ! اَنَّ بَعْضَ اَفْعَالِ اللّٰہِ یَتَرَتَّبُ عَلَی الْقُوَی الْمُوْدَعَۃِ فِی الْعَالَمِ بِوَجْہٍ مِنْ وُجُوہِ التَّرَتُّبِ شَہِدَ بِذٰلِکَ النَّقْلِ وَ الْعَقْلِ ... فَتِلْکَ الْقُوٰی:

(۱) مِنْھَا: خَوَاصُّ الْعَنَاصِرِ وَ طَبَائِعِھَا .

(۲) وَ مِنْھَا: الْاَحْکَامُ الَّتِیْ اَوْدَعَھَا اللّٰہُ فِیْ کُلِّ صُورَۃٍ نَوْعِیَّۃٍ .

(۳) وَ مِنْھَا: اَحْوَالُ عَالَمِ الْمِثَالِ وَ الْوُجُودُ الْمَقْضِیِّ بِہٖ ھُنَالِکَ قَبْلَ الْوُجُودِ الْاَرْضِیِّ.

(۴) وَ مِنْھَا: اَدْعِیَۃُ الْمَلَا الْاَعْلٰی بِجَھْدِ ھِمَمِھِمْ لِمَنْ ھَذَّبَ نَفْسَہٗ اَوْ سَعٰی فِیْ اِصْلَاحِ النَّاسِ ، و عَلٰی مَنْ خَالَفَ ذٰلِکَ.

(۵) وَ مِنْھَا: الشَّرَائِعُ الْمَکْتُوبَۃُ عَلٰی بَنِیْ آدَمَ وَ تَحَقُّقُ الْاَیْجَابِ وَ التَّحْرِیْمِ فَاِنَّھَا سَبَبُ ثَوَابِ الْمُطِیْعِ وَ عِقَابِ الْعَاصِیْ .

(۶) وَ مِنْھَا: اَنْ یَقْضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی بِشَیٍٔ فَیَجُرُّ ذٰلِکَ الشَّیٔ شَیْئاً آخَرَ ، لِاَنَّہٗ لَازِمُہٗ فِیْ سُنَّۃِ اللّٰہِ وَ خَرْمُ نِظَامِ اللُّزُومِ غَیْرُ مَرْضِیٍّ... فَکُلُّ ذٰلِکَ نَطَقَتْ بِہِ الْاَخْبَارُ ، وَ أَوْجَبَتْہُ ضَرُورَۃُ الْعَقْلِ'' (39)

(جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جاری قوتوں کا ایک غیر متبدل نظام قائم کیا ہے۔ ان قوتوں کے ایک ترتیب کے ساتھ فعال ہونے کے بعد ہی اللہ تعالیٰ کے بعض افعال اس دنیا میں وجود میں آتے ہیں۔ اس کی شہادت قرآن و سنت اور عقلی دلائل دیتے ہیں ...: (کائنات میں) کام کرنے والی غیر متبدل قوتیں درجِ ذیل ہیں:

1۔ مادی عناصر (Elements) کے طبیعی خواص اور اُن کے اثرات و نتائج۔

2۔ ہر ایک نوع کے بنیادی خواص اور اُن کے نوعی تقاضے۔

3۔ عالمِ مثال کے پیدا کردہ احوال و اثرات۔ اس کرۂ ارض پر چیزوں کے وجود میں آنے سے پہلے عالم مثال میں ان کا وجود ہوتا ہے۔

4۔ ملاءِ اعلیٰ کے اثرات: اپنے نفس کو مہذب بنانے اور انسانیت کی فلاح کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے ملاءِ اعلیٰ میں پوری ہمت سے دعائیں ہوتی ہیں۔ گناہوں کی آلودگی میں مبتلا نفوس اور انسان دشمنوں پر ناراضگی ہوتی ہے۔

5۔ شریعتوں کے احکامات: شریعتوں کے حلال و حرام کے مطابق فرماں برداروں کے لیے انعامات اور نافرمانوں

www.rahimia.org

کے لیے سزا ہوتی ہے۔

6۔ ایک کام کرنے کا حکم کسی دوسرے کام کے حکم کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ کام کیے بغیر پہلا کام نہیں ہوسکتا۔ ایسا کرنا کائنات میں جاری نظام کا لازمی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی خلاف ورزی پسند نہیں کرتا۔ ...

احادیثِ نبویہؐ کے مطالعے سے بھی کائنات کے نظام میں کارفرما ان غیر متبدل قوتوں کا پتہ چلتا ہے اور عقل بھی اسی کا تقاضا کرتی ہے۔)

شاہ صاحبؒ کی بیان کردہ اس حقیقت سے معلوم ہوا کہ ایک تو انسان کا اپنا نفس اور ذات ہے۔ انسانی ذات کے چاروں طرف مادی عناصر اور اُن کے خواص و اثرات ہیں۔ اس سے اوپر اس کے نوعی انسانی تقاضے ہیں جو انسانی خواص کی صورت میں ہیں۔ اس سے اوپر اگلا دائرہ عالم مثال اور اس کی قوتوں، یعنی ملاءِ سافل کا ہے۔ اس سے اوپر ایک اَور دائرہ ملاءِ اعلیٰ کا ہے اور اس کے اوپر ذاتِ باری تعالیٰ کی جانب سے جاری کردہ شریعت اور احکامات کی طاقت اور قوت ہے۔

کائنات میں جاری قوتوں کا یہ ایک مرتب نظام ہے، جو یہودیت، عیسائیت سمیت انبیا کے تمام مذاہب میں بیان کیا جاتا ہے۔ اسی طرح حکما اپنے خیال کے مطابق جب ''حکمتِ الٰہیہ'' پر بحث کرتے ہیں۔ تو وہ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ''واجب الوجود'' ہے۔ پھر ''واجب الوجود'' نے ''عقل اوّل'' پیدا کی۔ اس نے ''عقل ثانی'' پیدا کی۔ اور پھر ''عقل عاشر'' تک اس کائنات میں خالق و مخلوق کے ربط (link) کا حال ان کے ہاں بھی اسی طرح زیر بحث اور مُسلَّم رہا ہے۔ یہاں پر جو تعبیرات شاہ صاحبؒ نے بیان کی ہیں، وہ قرآن حکیم کی ہیں اور جامع ہیں۔ باقی لوگوں کی تعبیرات میں غلطیاں ہوئی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی دیگر کتابوں میں اُن کی تعبیرات کی غلطیاں واضح کی ہیں، جیسا کہ ''البُدور البازِغہ'' کے مقدمے میں اس کی کچھ تفصیل ہے۔

کائنات میں جاری قوتوں کا نظام غیر متبدل ہے

شاہ صاحبؒ نے اسی کے ساتھ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک اَور قانون واضح کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ﴿43﴾ (40)

(سو تو نہ پائے گا اللہ کا دستور بدلتا اور نہ پائے گا اللہ کا دستور ٹلتا۔)

اس سے معلوم ہوا کہ کائنات میں موجود مخلوقات کے لیے اللہ کی طرف سے جاری کردہ دستور اور طریقۂ کار میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ اللہ نے اس کرۂ ارض پر مخلوق پیدا کی، اس کے لیے ایک تدبیر کی اور اس میں مختلف قوتوں، تجلیات اور فرشتوں کا مرتب نظام قائم کیا۔ اس مرتب نظام میں موجود مخلوقات اور اشیا کے خواص و تاثیرات میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ تبدیلی کا مطلب کسی نہ کسی مخلوق یا قوت کا فنا ہوجانا ہے۔ اور اللہ کا یہ قانون اور ضابطہ ہے کہ جو پیدا شدہ مخلوق ہے، اس کے کام کرنے کے قاعدوں اور ضابطوں میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہے۔

علمِ اسرارِ دین کے مطابق یہاں تک کائنات کی حقیقت اور اس میں جاری قوتوں کے مرتب نظام کی بحث مکمل ہوجاتی ہے۔

www.rahimia.org

انسان کی اصل حقیقت اور نوعیت

کائنات اور اس میں جاری قوتوں کے مرتب نظام کی حقیقت بیان کرنے کے بعد شاہ صاحبؒ نے خود انسان کی حقیقت پر بحث کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسان دو قوتوں سے مرکب ہے: (۱) ایک مَلَکیت (۲) اور دوسری بھیمیت۔

1۔ انسان کا جسم، معدنیات، نباتات اور حیوانات کے وجود کے بعد انسانی شکل میں آیا ہے۔ اس کے تمام جسمانی تقاضے حیوانیت اور بہیمیت کی اساس پر ہیں۔ اس کو بھوک لگتی ہے، پیاس لگتی ہے۔ گرمی سردی سے بچاؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے کرۂ ارض پر رہنے کے لیے جسمانی تقاضوں کے مطابق لباس وغیرہ کی ضرورت ہے۔ جسمانی تقاضوں کا تعلق اس کی بھیمیت سے ہے۔

2۔ انسان میں دوسری قوت' روحِ حقیقی کی وَجہ سے مَلَکیت ہے، جو دراصل اوپر عالمِ ارواح سے آتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے انسانی روح کی حقیقت پر ''باب حقیقة الرّوح'' میں بڑی شان دار بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(الف) عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ''روح'' صرف اس مبدأ حیات کا نام ہے کہ جس سے زندگی کی سانس چل رہی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ: ہم جب اس پر غور و فکر کریں اور مزید اس کی کھوج لگائیں تو یہ انسانی مبدأ حیات اور اس کی اصل روح نہیں ہوسکتی، کیوں کہ یہ تو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس طرح انسان اور جانور میں کیا فرق ہوا؟

(ب) یا پھر اُسے روح کہا جائے کہ یہ جو ہم غذا کھاتے ہیں، اس غذا سے ایک توانائی (energy) پیدا ہوتی ہے۔ اس انرجی اور توانائی کو حکما نے ''قوتِ مدبرۂ بدن'' کہا۔ ڈاکٹروں نے اُسے ''وائٹل فورس'' (Vital Force) کہا۔ صوفیائے کرام نے احادیث کے مطابق اسے ''نسمہ'' کہا (جیسا کہ ''نسمُ بنیهِ''[41] کا لفظ خود نبی اکرم ﷺ نے استعمال کیا) یا کچھ حکما نے اس کو ''روحِ ہوائی'' سے تعبیر کیا ہے کہ کھانے سے جو توانائی پیدا ہوتی ہے، وہ ایک ہوا کی طرح جسم کے اندر سر سے پاؤں تک گردش کرتی ہے۔ انھوں نے اسی کو ''روح'' کہا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ یہ بھی حقیقی روح نہیں ہوسکتی۔ اس لیے کہ انسان کے اندر تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ غذا کے فرق اور دیگر نوعیت کی وَجہ سے انسان کی وائٹل فورس میں تغیر آجاتا ہے۔ آج میڈیکل سائنسز نے ثابت کردیا کہ ہمارے جسم میں جو خلیات (Cells) موجود ہوتے ہیں، وہ ایک سو بیس دن کے بعد فرسودہ ہو کر نکل جاتے ہیں۔ نئے سیلز اُن کی جگہ لے لیتے ہیں۔ یہ سیلز خوراک سے بنے تھے۔ اگر خوراک ہی کی توانائی روح ہے تو ہر ایک سو بیس دن کے بعد بدل جاتی ہے۔

(ج) انسان کی ان بدلتی ہوئی حالتوں میں ایک ایسی چیز بھی ہے جو تمام تر جسمانی تغیرات و تبدلات کے باوجود اپنی جگہ پر قائم ہے۔ مثلاً زید، زید ہی رہتا ہے۔ بکر، بکر ہی رہتا ہے۔ تمام تر تغیرات کے باوجود انسان بچپن سے لے کر بڑے ہونے اور بڑھاپے تک وہی رہتا ہے۔ اس کا نام بچپن میں جو رکھا گیا، بڑھاپے میں بھی وہی اس کا نام ہے۔ لہٰذا عقلی طور پر کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے، جس پر تغیر نہ آئے اور اس کے اندر کوئی تبدیلی نہ ہو۔ اور تمام تر جسمانی تغیرات و تبدلات اُسی پر ہونے چاہئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ انسان میں کوئی ایسی غیر متبدل حقیقت ہے، جو ''روحِ حقیقی'' ہے۔ چناں چہ اس کی تعریف شاہ صاحبؒ نے یہ کی ہے:

''الرّوح فی الحقیقة: حقیقة فُردانیة، و نقطة نورانیة، یجلّ طورها عن طور هٰذه الأطوار

المتغيّرة المتغايرة، الّتى بعضها جواهر و بعضها أعراض، و هى مع الصّغير كما هى مع الكبير، و مع الأسود كما هى مع الأبيض، إلٰى غير ذٰلک من المتقابلات. و لها تعلّق خاصّ بالرّوح الهوائى أوّلاً، و بالبدن ثانياً، من حيث أنّ البدن مطيّة النّسمة. وهى كُوّة من عالَم القدس ينزل منها علٰى النّسمة كلّما استعدّت لهٗ.'' (42)

(حقیقت میں روح ایک ایسی ''مفرد حقیقت'' اور ''نورانی نقطہ'' ہے کہ اس کا طور طریقہ (حیوانیت سے متعلق) دیگر تغیر پذیر طور و اطوار سے زیادہ روشن اور بلند تر ہوتا ہے۔ جب کہ ان میں کچھ جواہر ہوتے ہیں اور بعض اَعراض ہوتے ہیں۔ ان تمام تر تغیرات کے باوجود یہ روحِ حقیقی اپنی اصل حالت پر رہتی ہے، خواہ آدمی بچہ ہو یا بڑا، کالا ہو یا گورا۔ دیگر تمام متضاد حالات کے باوجود یہ روحِ حقیقی وہی کی وہی رہتی ہے۔ اس روح کا سب سے پہلے ''روحِ ہوائی'' کے ساتھ خاص تعلق قائم ہوتا ہے۔ پھر دوسرے درجے میں بدن سے نسمے کی سواری کی حیثیت سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ روحِ حقیقی دراصل ایک روشن دان ہے کہ جس کے ذریعے سے عالمِ قدس کے امور انسانی نسمے پر نازل ہوتے ہیں، جب اُس میں یہ استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے روحِ حقیقی کی تعریف کرتے ہوئے دو تین پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے: (۱) وہ ''**حقيقةٌ فُردانيةٌ**'' یعنی ایک ناقابلِ تقسیم حقیقت ہے۔ گویا ایک ایسا ایٹم (Atom) ہے، جو تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ (۲) وہ ''**نقطةٌ نورانيةٌ**'' یعنی ایک ایسا نورانی نقطہ ہے، جو ''روحِ ہوائی'' یا ''نسمہ'' کے تمام تر تغیرات و تبدلات کو روشن کرتا ہے۔ اس سے انسانی جسم کا ہر خلیہ روشنی پاتا اور توانائی حاصل کرتا ہے۔ گویا آج کی زبان میں یہی وہ چپ (Chip) ہے جو فرشتہ اوپر سے لاکر ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے تین مہینے کے بچے کے اندر فٹ (fit) کرتا ہے۔ یہ وہ نقطہ نورانی ہے جس نے اس کی انرجی کی بیٹری چارج کر دی اور انسان کے اندر سانس لینے کا عمل بحال ہو گیا۔ (۳) تیسرا یہ کہ یہ روحِ حقیقی عالمِ قدس سے انسانی نسمے پر کھلنے والا ایک ایسا روشن دان ہے، جس کے ذریعے سے وہاں کے امور اس نسمے پر نازل ہوتے ہیں۔

الغرض! شاہ صاحبؒ نے کہا کہ انسان کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک قوتِ ملکی یعنی نقطہ نورانی اور دوسرے بہیمی تقاضوں پر مشتمل جسم ہے۔ دونوں کے کچھ تقاضے ہیں؛ جسم کے کچھ تقاضے ہیں کہ غذا، کھانے پینے، رہنے سہنے کی ضرورت پیش آتی ہے، جس سے اس میں بہیمی قوت پیدا ہوتی ہے جو اس میں حیوانی خصائص اور طاقت و قوت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح اس کی روحِ حقیقی اور نقطۂ نورانی کے تقاضے ہیں، جس سے اس کے اندر قوتِ ملکی پیدا ہوتی ہے۔ یوں انسان جسم اور روحِ حقیقی سے مرکب ہے۔

ان دونوں قوتوں کے درمیان ایک کش مکش ہے۔ ایک عرش سے آیا ہوا نقطۂ نورانی ہے اور ایک فرش سے پیدا شدہ خوراک کا نسمہ اور جسم ہے۔ ان دونوں قوتوں کے باہمی اعتدال سے انسان قائم رہتا ہے۔ تخلیقِ انسانیت سے متعلق جاری سنتُ اللہ کے مطابق اس کرۂ ارض پر رہتے ہوئے انسان کی دونوں قوتیں نہ ایک دوسرے کو چھوڑ سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کو فنا کر سکتی ہیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ پر اعتدال اور صلح کے ساتھ رہنا ہے۔ سب سے اعلیٰ ترین انسان وہ ہوتے ہیں، جن کی قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ کے درمیان صلح اور تصالح موجود ہو۔ جن لوگوں کی ان دونوں قوتوں میں صلح نہیں ہے، ان میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ

www.rahimia.org

کبھی بھیمیت غالب آجاتی ہے تو مَلَکیت چُھپ جاتی ہے اور کبھی مَلَکیت غالب آجاتی ہے تو بھیمیت چُھپ جاتی ہے۔ اسی کش مکش میں اعتدال کی حالت پر رہنا ہی انسان کا امتحان ہے۔

جب انسان ان دونوں قوتوں کا مجموعہ ہے تو انسانی ترقی اور فائدے کے لیے ایسا نظام بہتر قرار پائے گا کہ جو بیک وقت اس کے جسم کی ضروریات کو بھی صحیح طریقے سے پورا کرے اور اس کی روح کی ضروریات کو بھی صحیح طریقے سے پورا کرے۔ روح کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے جسم کو فنا کر دینا یا جسم کی خواہشات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے روح کے تقاضوں کو نظر انداز کر دینا قطعی غلط ہے۔ دنیا کا ہر نظام، مذہب، ملت، قانون اور ضابطہ ان دونوں میں اعتدال پیدا کرے تو وہ درست قرار پائے گا۔ یہی انسانی سعادت اور کامیابی کہلائے گی۔ اگر کسی ایک کے تقاضوں کو سِرے سے ختم کر کے دوسرے کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر کوئی بھی قانون، ضابطہ اور نظام بنایا جائے تو وہ غلط ہے، اور درست نہیں ہے۔

انسان کے لیے قوانین اور شریعتوں کی پابندی کی ضرورت اور اہمیت

شاہ صاحبؒ نے انسان کی اصل حقیقت بیان کرنے کے بعد اس سوال کا جائزہ لیا ہے کہ دنیا میں تمام انسانی معاشروں میں قوانین وضوابط اور شریعتوں کی پابندی کیوں ضروری ہے؟ اس سلسلے میں شاہ صاحبؒ نے اس قرآنی آیت سے استدلال کیا ہے:

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ (43) (ہم نے (شریعت کی پابندی کی یہ) امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کو پیش کی، پھر کسی نے قبول نہ کیا کہ اس بوجھ کو اٹھائیں، وہ اس سے ڈر گئے۔ انسان نے اسے اٹھا لیا۔ (اس لیے کہ) وہ ظلم میں گھرا ہوا اور جاہل تھا۔)

اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ انسان نے اس ''امانت'' (شریعت) کو اس لیے اٹھایا کہ وہ ''ظلوم'' اور ''جہول'' تھا۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ شریعتوں کی پابندی سے انسانوں میں موجود جہالت کا خاتمہ ہوتا ہے اور وہ علم و شعور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اور ظلمتوں کے اندھیرے چھٹتے اور عدل و انصاف کا نظام قائم ہوتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ انسان کی قوتِ ملکیہ اور قوتِ بہیمیہ میں باہم کش مکش ہوتی رہتی ہے۔ اس کی قوتِ ملکیہ اسے بلندی کی طرف لے جانا چاہتی ہے اور اس کی بہیمی قوت پستی کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ اس کش مکش میں بہیمیت کے غلبے سے اس میں ظلم اور جہالت پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ٹھہرا کہ وہ اپنی جبلی اور فطری استعداد اور نوعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اللہ کی جانب سے نازل ہونے والے قوانین اور شریعتوں کی پابندی اختیار کرے، تاکہ اُس کی ملکیت مضبوط ہو اور انسانی مزاج میں علم و شعور اور عدل و انصاف پروان چڑھے۔ ظلم و جہالت کا خاتمہ ہو۔

انسان کے لیے قانون اور شریعت کی پابندی؛ کائنات کی عالم گیر تقدیر کی تکمیل

علم و شعور اور عدل و انصاف کے حصول کے لیے انسان کو قوانین اور شریعتوں کا پابند بنانا ضروری ٹھہرا۔ علم و فکر اور تخیل کی پرواز کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو، اسے عمل میں لانے کے لیے معروضی حقائق کی حد بندی کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اسی لیے انسان کو اس محدود دنیا میں ترقی کے لیے صحیح علم و فکر پر مبنی قوانین اور شرائع کی پابندی اختیار کرنا ہوتی ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ دنیا بھر کے تمام

www.rahimia.org

قوانین اور تمام شرائعِ الٰہیہ انسانوں کو علم و عدل پر مبنی کاموں کا پابند بناتی ہیں۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ کائنات ایک عالم گیر تقدیر کے نظام میں بندھی ہوئی ہے۔ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ تقدیر کا ایک نظام جاری ہے۔ شاہ صاحبؒ نے اس موقع پر اس سوال کا جائزہ لیا ہے کہ انسان کی تقدیر کی اصل حقیقت کیا ہے اور اس کے لیے مقرر کردہ شریعت کا اس تقدیر سے کیا تعلق ہے؟ پھر شریعت اور تقدیر کے درمیان تعلق اور ربط کی نوعیت کیا ہے؟ علم اسرارِ دین میں یہ بحث بڑی بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ چناں چہ ''تقدیر'' اور ''تشریع'' کو سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ''تقدیر'' کی بہت عمدہ تشریح کی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ہر چیز کو جب اللہ نے پیدا کیا تو اس کے خواص، اُس کا دائرۂ کار اور اس کی محدودیتوں کا بھی تعین کر دیا۔ وہ چیز تبھی بہتر رہے گی جب وہ اپنے مخصوص خواص کے دائرے میں رہے۔ شاہ صاحبؒ نے نباتات اور حیوانات کی خصوصیات کے تناظر میں اسے چند مثالوں سے واضح کیا ہے۔ حیوانات میں مثلاً شیر پیدا کیا، اسے غذا کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دیگر جانور؛ بیل، گائے، اونٹ اور بھینس پیدا کیے، انھیں بھی کھانے کی ضرورت ہے۔ مثلاً ان سب کی غذائی محدودیت کا ایک دائرہ ہے۔ شیر کی غذائی تقدیر گوشت کھانا ہے۔ شیر گوشت کھائے گا تو صحت مند رہے گا، وہ گھاس کھائے تو بیمار پڑ جائے گا۔ بیل اور بھینس چارہ اور گھاس کھائیں گے تو صحت مند رہیں گے۔ انھیں چھیچھڑے اور گوشت ڈال دیا جائے اور انھیں یہ کھانے پر مجبور کیا جائے، یہ اُن کے تقدیری خواص کے خلاف ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ ہوا کہ اس کرۂ ارض پر پیدا ہونے والی ہر مخلوق اور ہر چیز کے خواص، اثرات اور اس کے اعمال اور کردار کا الگ الگ دائرۂ کار متعین کر دیا گیا ہے۔ انھی خواص اور دائرۂ کار کی پابندی سے ہی وہ مخلوق صحت منداور ہر چیز درست طور پر قائم رہتی ہے۔

دیکھیے! ہم زمین میں کوئی پودا کاشت کرنے کے بعد پوٹاشیم (Potassium) ڈالتے ہیں، فاسفورس (Phosphorus) ڈالتے ہیں، اسے پانی دیتے ہیں، گوڈی کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تیار کی ہوئی زمین میں جس قسم کا پودا لگائیں گے، یہ تمام غذائی مواد اُسی طرح کے پودے کی نشو ونما کرے گا۔ تمام پودوں کے لیے ہوا ایک جیسی ہے، پانی ایک جیسا ہے، کھاد ایک جیسی ہے، مگر ایک جگہ پر ہم نے آم کا پودا لگایا ہے، دوسری جگہ پر انگور یا سیب وغیرہ کا۔ اب آم کے ''نفسِ شجری'' یعنی شجری روح نے آم کے درخت کی نشو ونما کی۔ آم کے درخت کی متعین تقدیر کے مطابق اس کے خاص طرح کے پتے ہوں گے، مخصوص پھل اور مخصوص ذائقہ ہوگا، مخصوص قد و قامت (height) ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح سیب وغیرہ سمیت ہر درخت کی مقرر کردہ خصوصیات کے مطابق اس کی قد و قامت، اس کے خواص اور اُس کی تاثیرات ہیں۔ یہ اُس کی ''تقدیر'' ہے۔

اسی طرح اس کرۂ ارض پر دیگر مخلوقات پر غور کریں، یہاں جتنی بھی معدنیات؛ آکسیجن، ہائیڈروجن اور دیگر تمام عناصر (Elements) ہیں، ان کے الگ الگ خواص اُن کی تقدیر ہیں۔ ایسے ہی فرشتے پیدا کیے، ان کی بھی ایک تقدیر مقرر کی کہ:

لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝ (44)

(وہ اللہ کے دیے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جاتا ہے، اسے بجالاتے ہیں۔)

فرشتوں کو نہ بھوک لگتی ہے، نہ پیاس لگتی ہے، نہ انھیں کسی اَور چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اُن کی تقدیر ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان کی بھی ایک تقدیر ہے کہ وہ اپنے انسانی نوع کی حیثیت سے کچھ خواص و

امتیازات رکھتا ہے۔ جیسا کہ گزشتہ بحث سے واضح ہوا کہ انسان ملکیت اور بہیمیت سے مرکب ایک مخلوق ہے، جس میں زمینی اور سماوی دونوں خصوصیات جمع ہیں۔ یہ روح اور جسم کا ایسا مرکب ہے، جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (45) (اور ہم نے انسان کو خوب صورت انداز میں پیدا کیا)۔

دنیا کی کوئی مخلوق انسان کی طرح کی نہیں ہے۔ فرشتے بھی یک طرفہ عرشی مخلوق ہیں اور یک طرفہ تقدیر رکھتے ہیں۔ اسی طرح تمام زمینی مخلوقات؛ عناصر سے حیوانات تک یک طرفہ تقدیر رکھتی ہیں۔ حضرت انسان وہ مخلوق ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے زمین کے مادی خواص پر مشتمل اس کا ''جسم'' اور عرش سے نازل ہونے والے نورانی نقطے پر مشتمل ''روح'' دونوں رکھ دیے ہیں۔ ان دونوں کے باہمی اجتماع سے انسان وجود میں آیا ہے۔

اب شریعت دراصل نوعِ انسان کی کامیابی کے لیے ''تقدیر'' ہی ہے۔ شریعت آ کر یہ بتلاتی ہے کہ تمھارا جسم صاف ستھرا اور پاکیزہ رزقِ حلال کھائے گا اور درست طریقے سے ارتفاقات کی زندگی بسر کرے گا تو تمھاری جسمانی صحت ٹھیک رہے گی اور اگر تم جسم کو نقصان پہنچانے والا ناپاک رزقِ حرام کھاؤ گے اور اپنے ارتفاقات میں ظلم کرو گے اور دوسرے کو نقصان پہنچاؤ گے تو تمھاری جسمانی صحت بگڑ جائے گی۔ اسی طریقے سے مَلَکِی یعنی روحانی تقاضوں کی تم تکمیل پذیر کرو گے تو تمھاری روح ترقی کرے گی۔ شریعت کے قوانین انسان کی ملکیت کی غذا مہیا کرنے کے لیے ''اَخلاق اور اقترابات'' اور انسانی جسم کی ضرورت پورا کرنے کے ''ارتفاقات'' کی تعلیم دیتے ہیں۔ انسان جب ان دونوں پر عمل کرتا ہے تو اس کی جسمانی اور روحانی صحت ترقی کرتی ہے۔ اس طرح شریعت دراصل اس کی تقدیر کا تکملہ ہے۔ تقدیر اور تشریع کی حقیقت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''تشریع تتمہ تقدیر است؛ اما تقدیر: عبارت ازاں است کہ برائے ہر نوعے خِلقت، و اَخلاق، و افعالِ او معیّن کنند۔ انسان؛ ناطق، فاہمِ خطاب است، بادی البِشرہ، مُستوی القامہ، ماشی علٰی رِجلین۔...

وتشریع: عبارت ازاں است کہ انسان چوں مرکب است از دوقوت: (۱) مَلَکیہ، (۲) وبہیمیہ۔ اعتدالِ نوعے اُو تقاضا مے کند کہ آں حرکات را کہ بہ سببِ آں ہر دوقوت بجائے خود بہ ماند۔ و در معاد سعادت نصیب اُو شود، و در ارتفاقاتِ ضروریہ؛ از آدابِ معیشت، و نکاح، و ابتغائے معیشت، و سیاستِ مدن از جادۂ قویمہ بیرون نہ رود۔ و ایں ہمہ احوال و افعال را برائے نوعِ انسان معیّن کردن تشریع است۔''(46)

(تشریع' تقدیر کا تتمہ ہے۔ تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ ہر مخلوق کے لیے اس کی جسمانی ساخت، اُس کے اَخلاق اور افعال کو متعین کر دینا، مثلاً انسان (ایک مخصوص جسمانی ساخت رکھتا ہے) بولتا ہے، دوسرے کی بات سمجھتا ہے، اس کی جسمانی جلد گھنے بالوں سے ڈھکی ہوئی نہیں، بلکہ ظاہر ہے، وہ سیدھا کھڑا ہوتا ہے، دونوں پاؤں پر چلتا ہے۔...

تشریع کی حقیقت یہ ہے کہ انسان دو قوتوں مَلَکِیت اور بہیمیت سے مرکب ہے۔ نوعِ انسانیت کے اعتدال کا تقاضا ہے کہ اس کی دونوں قوتوں سے جو حرکات اور اعمال صادر ہوں، اس سے وہ اپنی انسانیت کو اصل حالت پر برقرار رکھے۔ اسے آخرت میں کامیابی نصیب ہو۔ وہ اپنے ضروری ارتفاقات مثلاً زندگی بسر کرنے کے آداب، نکاح، وسائلِ معاش کی تلاش، قوموں اور ملکوں کی سیاست میں سیدھے راستے سے باہر نہ جا پڑے۔ ان تمام احوال و افعال کو انسانی

نوع کے لیے متعین کر دینا قانون اور شریعت کا نفاذ کہلاتا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' میں ''باب انشقاق التّکلیف من التّقدیر'' میں اس پر تفصیلی طور پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے یہ بات واضح کی ہے کہ عالم گیر تقدیر کا تقاضا اور اس کی تکمیل تبھی ہوتی ہے کہ انسان کو شریعت کا مکلّف بنایا جائے۔ انسان میں ظلمت اور جہالت تھی۔ اس کی جہالت کو ملکیت کے علمی نور سے منور کرنا اور اس کی ظلمتوں اور ناانصافیوں کو ملکیت کے نور سے پھوٹنے والے عدل و انصاف سے دور کرنا ضروری ہے۔ یہی شریعت ہے، جو دراصل اس کی تقدیر ہے۔

تقدیر اور تشریع کے صحیح ربط کی وضاحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ کے اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ جب وہ لشکر لے کر شام کی طرف جا رہے تھے تو پتہ چلا کہ جہاں جا رہے ہیں، اُس علاقے میں طاعون کا مرض پھوٹ پڑا ہے، اس سے لوگ مر رہے ہیں۔ اس پر مجلس مشاورت منعقد ہوئی کہ طاعون زدہ علاقے میں جانا چاہیے یا واپس پیچھے جا کر انتظار کیا جائے؟ لوگوں کی آرا آنے کے بعد حضرت عمر فاروقؓ نے فیصلہ کیا کہ ہم واپس چلتے ہیں۔ جیسے ہی انھوں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا، اس پر امین الامہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہٗ کہنے لگے کہ: ''أ فِراراً من قدر اللّٰه؟'' (کیا یہ اللہ کی تقدیر سے بھاگنا نہیں ہے؟) گویا انھوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے فیصلے کو تقدیر سے متصادم قرار دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بڑا برجستہ جواب دیا:

''نعم! نُفِرُّ من قدر اللّٰه إلى قدر اللّٰه'' (ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے نکل کر دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں)۔

یعنی ہم نے جو طاعون سے بچنے کے لیے مشورے سے واپس جانے کا فیصلہ کیا ہے تو یہ بھی تقدیر ہے۔ شریعت کی پابندی کرتے ہوئے ایک اندازے (تقدیر) سے نکل کر دوسرے اندازے کی طرف جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اتنے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو کسی کام کے لیے گئے ہوئے تھے، تشریف لے آئے اور انھوں نے حضورؐ کی یہ حدیث سنائی:

''إذا سمعتم به بأرضٍ فلا تقدموا عليه، و إذا وقع بأرضٍ و أنتم بها فلا تخرجو فراراً منهُ.''[47]

(جب تم کسی زمین میں طاعون کے بارے میں سنو تو اس طرف آگے مت بڑھو۔ اور جب کسی جگہ پر یہ مرض آجائے اور تم وہاں موجود ہو تو اس سے ڈر کر مت بھاگو۔)

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کے ضابطے اور قوانین دراصل انسان کی تقدیر کی تکمیل کرتے ہیں۔ انسان اپنے جسم کو صحت مند بنانے کے بجائے جسم کو نقصان پہنچانے والے عمل کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ اب اس کا امتحان یہ ہے کہ یہ جو تمھارے اندر دونوں طرح کے کام کی استطاعت اور قدرت تھی، اسے شریعت کے قوانین کے مطابق عمل کر کے تم نے اپنے جسم کو صحت مند بنایا ہے یا اس کی خلاف ورزی کر کے اسے نقصان پہنچایا ہے۔

انسان کی عقلی اور عملی صلاحیت اور قرآن حکیم کے بنیادی علوم

شاہ صاحبؒ نے تشریع و تقدیر کا حقیقی مفہوم بیان کرنے کے بعد اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ انسان کی نوعی ضروریات کے تحت جو تشریعی علوم رکھے گئے ہیں، وہ انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ انسان کی انسانیت ان کے بغیر دُنیوی اور اُخروی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ حیوانیت کے دائرے سے اوپر اٹھ کر انسانیت کی امتیازی خصوصیت اس میں عقلی اور عملی قوتوں کا ہونا ہے۔ شاہ

www.rahimia.org

صاحبؒ انسان کی قوتِ عقلیہ اور قوتِ عملیہ کی نوعیت اور اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''**الأُمور الّتی یمتاز بها الإنسان من سائر أفراد الحیوان کثیرةٌ جدًّا، لکن جماع الأمر و مِلاکه خصلتان: أحدهما زیادة القوّة العقلیة؛ و لها شعبتان: (١) شعبة غائصة فی الارتفاقات لمصلحة نظام البشر، و استنباط دقائقها. (٢) و شعبة مستعدّة للعُلوم الغیبیة الفائضة بطریق الوهب.**

و ثانیهما: براعة القوة العملیة؛ و لها أیضاً شعبتان: (١) شعبة هی ابتلاعها للأعمال من طریق بلعوم اختیارها و إرادتها ... (٢) و شعبة هی أحوال و مقامات سنیّة کمَحبّة اللّٰه و التّوکّل علیه ممّا لیس فی بهائم جنسها.'' (48)

(ایسے امور جن کی وَجہ سے انسان حیوانات کے تمام افراد سے ممتاز ہوتا ہے، اگرچہ بہت سے ہیں، لیکن اُن تمام اُمور کا خلاصہ اور مرکز و محور درجِ ذیل دو اُمور ہیں:

1۔ انسان میں قوتِ عقلیہ کا زیادہ ہونا۔ پھر اس کے دو شعبے ہیں:

(الف) عقلی قوت کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جس میں انسانیت کے لیے بہترین نظام قائم کرنے کے لیے ارتفاقات پر غور و فکر کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے اہم ترین مسائل کا حل دریافت کیا جاتا ہے۔

(ب) عقلی قوت کا دوسرا شعبہ یہ ہے کہ وہبی طور پر ایسی عقلی استعداد حاصل ہو کہ جس سے اس پر غیبی علوم کا فیضان ہو۔

2۔ انسان میں اعلیٰ درجے کی قوتِ عملیہ کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کے بھی دو شعبے ہیں:

(الف) ایک شعبہ یہ ہے کہ اپنے اختیار اور ارادے سے کیے ہوئے اعمال کو انسان اپنی روح میں محفوظ رکھتا ہے۔

(ب) عملی قوت کا دوسرا شعبہ یہ ہے کہ اُس کے صحیح اعمال کے نتیجے میں اُسے ایسے بہترین احوال اور بلند تر مقامات حاصل ہوں، مثلاً اللہ کی محبت اور اُس پر توکل۔ یہ چیزیں جانوروں میں نہیں پائی جاتیں۔)

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی عقلی اور عملی استعداد کی تکمیل کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانوں میں بلند مرتبہ امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتابِ مقدس قرآن حکیم نازل کی ہے، جس میں اُس کی عقلی اور عملی قوتوں کو جلا بخشنے کے لیے اعلیٰ درجے کے علوم، شریعت کے قوانین اور قواعد، محبتِ الٰہی کے احسانی مقامات بتلائے گئے ہیں۔ اس حوالے سے قرآن حکیم میں درجِ ذیل سات بنیادی علوم نازل کیے گئے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''**(١) منها علم التّوحید و الصّفات ... (٢) و منها علم العبادات ... (٣) و منها علم الارتفاقات ... (٤) و منها علوم المخاصمة ... (٥) و منها علم التّذکیر بآلاء اللّٰه ... (٦) و بأیّام اللّٰه ... (٧) و بوقائع البرزخ و الحشر.**'' (49)

یہ تمام علومِ قرآنیہ ہیں، جو انسان کی عقلی اور عملی قوتوں کو مہمیز دیتے ہیں اور ان کو کمال تک پہنچانے کی استعداد پیدا کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ''**الفوز الکبیر**'' میں شاہ صاحبؒ نے پانچ علوم کا تذکرہ کیا ہے، جب کہ ''**حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**'' میں علمِ اسرارِ

www.rahimia.org

دین کی بحث میں سات قرآنی علوم کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ یہاں ابتدائی تین علوم کی تفصیل بیان کرنا مطلوب ہے۔ ''**الفوز الکبیر**'' میں ابتدائی تین علوم یعنی (۱) **علم التّوحید و الصّفات**، (۲) **علم العبادات** اور (۳) **علم الارتفاقات** کو ''**علم الاحکام**'' کے ذیل میں بیان کر کے فقہی کتابوں اور ''**حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**'' کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔

نبی اکرمؐ پر ان علوم کے نزول کی مختلف کیفیات اور اس کا پورا پراسیس شاہ صاحبؒ نے بیان کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ انسان کی بہیمیت اور ملکیت کو اعتدال پر رکھنے کے لیے علوم کی ضرورت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ''**حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**'' میں شریعت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انسانوں کو جن علوم کا مکلّف بنایا گیا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہمیت علومِ قرآنیہ کی ہے، جو انسان کی ترقی اور کامیابی کے لیے نبی اکرمؐ پر نازل ہوئے اور قرآن حکیم کی شکل میں ہمارے سامنے آئے۔ پھر آپؐ کی احادیث کی صورت میں ان علوم کی عملی تفصیلات بیان ہوئیں۔

شریعت کی پابندی کا لازمی نتیجہ؛ جزا و سزا کا قانون

اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے یہ واضح کیا ہے کہ جب انسانوں کو شریعت اور قانون کا پابند بنایا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ اُن کے لیے جزا و سزا پر مشتمل قانونِ مجازات بھی ہونا چاہیے۔ جو انسان شریعت اور قانون کے مطابق زندگی بسر کرے، اس کے لیے انعام و اکرام اور جو انسان قانون شکنی کرے، اسے سزا دی جائے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''**إعلم! أنّ الإنسان مجزیون بأعمالهم، إن خیراً فخیرٌ، و إن شرّاً فشرٌّ، من أربعة وجوه:**

(۱) أحدها: مقتضی الصّورة النّوعیة ... (۲) و ثانیها: جهة الملاء الأعلٰی ...

(۳) و ثالثها: مقتضی الشّریعة المکتوبة علیهم ... (۴) و رابعها: أنّ النّبیّ إذا بُعث فی النّاس.''[50]

(جاننا چاہیے کہ انسان اپنے اعمال کی جزا پائیں گے۔ اگر اچھے کام کریں گے تو اچھی جزا ہوگی۔ اور اگر بُرے کام کریں گے تو بُری جزا ہوگی۔ درجِ ذیل چار وجوہات سے جزا و سزا ہوتی ہے:

(۱) انسانی نوع کے تقاضوں کو پورا کرنے یا نہ کرنے کی وَجہ سے جزا و سزا

(۲) ملاءِ اعلیٰ کے احکامات کی پابندی یا خلاف ورزی کی وَجہ سے نازل ہونے والی جزا و سزا

(۳) اللہ کی طرف سے انسانوں کے لیے لکھی گئی شریعت (کتبِ مقدسہ) کی پابندی یا خلاف ورزی کی جزا و سزا

(۴) ہر دور میں آنے والے نبی کی تعلیمات کو قبول کرنے یا اُس کی خلاف ورزی کی جزا و سزا۔)

شاہ صاحبؒ نے تفصیل کے ساتھ جزا و سزا کے قانون کو بڑے مربوط انداز میں بیان کیا ہے۔ اور یہ بات واضح کی ہے کہ جزا و سزا کے پہلے دو دائروں کا تعلق انسانیت کی اُس فطرت کے ساتھ ہے، جس پر اللہ نے اسے تخلیق کیا ہے۔ ان دونوں دائروں کا تعلق نیکی اور بدی کے بنیادی اساسی اصولوں سے ہے۔ یہ اصول زمانے کے تغیر و تبدل سے بدلتے نہیں ہیں۔ تمام انبیا علیہم السلام انھی اصولوں کی دعوت دیتے ہیں۔ جزا و سزا کا تیسرا دائرہ زمانے کے تغیر و تبدل سے بدل جاتا ہے۔ ہر دور کے لیے اللہ تعالیٰ جو کتابِ مقدس متعین فرماتے ہیں، اسی کے مطابق دنیا میں عمل درآمد کے لیے انبیا بھیجے جاتے ہیں۔ اس طرح کائنات کے حکمرانِ مطلق اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کی ترقی کے متفقہ اور فطری اصولوں کے عملی نفاذ کی شریعت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ ان احکامات

www.jamia.org

کے نفاذ کے لیے بہ طور اتھارٹی انبیاؑ کو بھیجا جاتا ہے۔ جزا و سزا کے چوتھے اصول کا اطلاق کسی نبی کے دنیا میں مبعوث ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ جسے نبوت کی اتھارٹی دے کر دنیا میں بھیجا گیا ہے، اس کو ماننے یا نہ ماننے کی بنیاد پر جزا و سزا ہوتی ہے۔

علمِ استعدادِ انسانیت اور اس کی اقسام

اب تک کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحبؒ نے کائنات کی حقیقت اور اس کے عالم گیر تقدیری اور تشریعی نظام سے متعلق مسلمہ اصول و قواعد بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد انسانی اعمال و اَخلاق کی اساس بننے والی انسانی جبلت کی حقیقت اور اس کی اقسام بیان کی ہیں، تا کہ اعمال کے خواص و نتائج اور اَخلاق و ملکات کی حقیقی نوعیت اور اس حوالے سے انسانوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافِ فکر و عمل کی وضاحت ہو جائے۔ یہ ''علمِ استعدادِ انسانیت'' کہلاتا ہے۔ اس علم کی جلالتِ شان بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ اپنی خودنوشت میں لکھتے ہیں:

''علمِ کمالاتِ اربعہ... و علمِ استعدادِ نفوسِ انسانیۃ بجمعیھا و کمال و مآل ہر کسے افاضہ فرمودند۔ و ایں ہر دو علم جلیل اند کہ پیش ازیں فقیر کسے بر گردِ آں نہ گشتہ۔''(51)

(علمِ کمالاتِ اربعہ ...اور تمام انسانوں کی استعداد اور ہر انسان کے کمال اور اس کے مآل کا علم مجھ پر افاضہ کیا گیا ہے۔ یہ دونوں علم بہت زیادہ بلند مرتبہ ہیں کہ اس فقیر سے پہلے کوئی ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچا۔)

شاہ صاحبؒ نے اس علم میں انسانی جبلت پر بڑی تحقیق کی ہے۔ اس سلسلے میں حدیثِ نبویؐ سے استدلال کیا ہے:

''إذا سمعتُم بِجَبَلٍ زالَ عن مكانِهٖ فصدّقوہُ، و إذا سمعتُم برجلٍ تغيّر عن خُلقِهٖ فلاتُصدّقوا بهٖ، فإنّهٗ يصير إلٰى ما جُبل عليه.'' (52)

(جب تم کسی پہاڑ کے بارے میں سنو کہ وہ اپنی جگہ سے ہل گیا ہے تو اس کی تصدیق کر دو۔ جب تم سنو کسی آدمی کے بارے میں کہ اُس نے اپنی عادت بدل لی ہے، تو اس کی تصدیق مت کرو۔)

حضورؐ نے فرمایا کہ آپ کو اگر کہا جائے کہ پہاڑ اپنی جگہ سے اُٹھ کر چلا گیا، مان لیں، لیکن اگر کہا جائے کہ فلاں آدمی کی جبلت بدل گئی تو اس کی کبھی تصدیق نہ کریں۔ اب یہ جبلت کیا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے اس کی لاجواب تشریح کرتے ہوئے اس کی اہمیت بیان کی ہے: ''اس سلسلے میں اللہ نے مجھ پر دروازہ کھولا ہے اور مجھے اس جیسی احادیث کے معانی اور مطالب سمجھائے ہیں۔''

شاہ صاحبؒ کے نزدیک جبلت یہ ہے کہ ہر انسان ملکیت اور بہیمیت کے مجموعے سے پیدا ہوا ہے۔ اب ملکیت کی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک ملکیتِ عالیہ اور (۲) دوسری ملکیتِ سافلہ۔ اگر روح کی مناسبت ملاءِ سافل سے ہے تو اس کی ''ملکیتِ سافلہ'' ہوگی۔ اگر ملاءِ اعلیٰ سے مناسبت رکھنے والی روح ہے، جیسے انبیائے کرامؑ، اولوالعزم اولیاء اللہؒ اور اونچے درجے کے ذہین لوگوں کی ارواح ہیں تو وہ ''ملکیتِ عالیہ'' کہلاتی ہے۔ اسی طریقے سے بہیمیت کی بڑی دو قسمیں ہیں: (۱) ایک ''بہیمیتِ شدیدہ'' یعنی خالص بہیمیت، جو طاقت اور توانائی، قوت، غرور اور تکبر سے عبارت ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ایک پلے ہوئے نر حیوان سے تشبیہ دیتے ہوئے خالص بہیمیتِ انسانی کو بیان کیا ہے۔ (۲) دوسری ''بہیمیتِ ضعیفہ'' جو کہ کمزور اور ضعیف ہوتی ہے، جیسا کہ کمزور و ضعیف

www.rahimia.org

بہیمیت والے مریل جانور میں ہوتی ہے۔

انسانی روح کی کل چار اقسام ہوئیں: (۱) ملکیتِ عالیہ، (۲) ملکیتِ سافلہ، (۳) بہیمیتِ شدیدہ، (۴) بہیمیتِ ضعیفہ۔

پھر ہر ایک انسان میں موجود بہیمی اور ملکی قوتوں کی دو ممکنہ قسموں میں سے کوئی ایک ہوگی:

(۱) تصالح: دونوں قوتوں میں مصالحت ہونا۔ (۲) تجاذُب: دونوں کے درمیان باہمی کش مکش ہونا۔

چوں کہ دونوں قوتیں اپنی اصل کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ ایک کی لذت اور راحت دوسری قوت کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ اگر ہر ایک قوت اپنا خالص حکم مانگے تو ان کے درمیان کش مکش ہوگی، اسے ''تجاذب'' کہتے ہیں۔ اگر ملکیت اپنے اصل حکم سے کچھ نیچے اُتر کر بہیمیت کے ساتھ صلح کرلے اور بہیمیت بھی اپنے اصل حکم سے کچھ اوپر اٹھ کر ملکیت کے ساتھ صلح کرلے تو اسے ''تصالح'' کہتے ہیں۔

ان دونوں کو پہلی چار کے ساتھ ضرب دینے سے انسانی جبلت کی کل آٹھ اقسام بنتی ہیں۔ پھر ہر ایک ملکیت اور بہیمیت اور دونوں کے اجتماع کی تجاذب اور تصالح کی تمام حالتوں کے درمیان لاکھوں کروڑوں، بلکہ لامتناہی اقسام بن جائیں گی۔ جس انسان میں جس درجے کی ملکیت اور بہیمیت اور اس کے اجتماع کی تصالح یا تجاذب کی حالت ہوتی ہے، وہی اس کی جبلت ہے۔

ہر انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اپنی جبلت کے مطابق اس میں ایک الگ جسمانی ساخت اور طاقت وقوت ہوتی ہے۔ وہ کتنا جسمانی بوجھ برداشت کرنے کی طاقت رکھتا ہے، وہ کتنا بلند آواز ہے، کتنی پکڑنے کی طاقت ہے، کتنی اعلیٰ درجے کی جسمانی طاقت ہے۔ ایسے ہی اُس کی ملکیت کا اظہار انسانی عقل اور شعور سے ہوتا ہے کہ اس کی ذہانت کتنی ہے، عقل کتنی ہے، اس میں چیزوں کے ادراک کرنے کی اور مختلف اور منتشر چیزوں میں آپس میں جمع کرنے (sum-up) کی کتنی طاقت اور قوت ہے۔

جبلت کے حوالے سے یہ حقیقت پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ آدمی ملکیت اور بہیمیت کے حوالے سے جس ساخت کے مطابق پیدا ہوا ہے، اسی کے مطابق تمام زندگی کام کرے گا۔ مثلاً کسی انسان کی بہیمیت ضعیف ہے، اس کی پیدائشی نشو و نما (growth) ناقص ہے۔ ایسے آدمی کو ڈاکٹر کتنے ہی وٹامن کیوں نہ دے دیں، کیا کوئی میڈیکل سائنس ہے جو اُس کو بہادر اور دلیر بنا دے اور اس کی بہیمیت کو طاقت ور اور بہتر کردے؟ وہ اس کی جبلی ساخت کو نہیں بدل سکتا۔ اسے اسی جبلی ساخت کے اندر رہ کر ہی تمام امور سرانجام دینے ہیں۔ جس درجے کی ذہانت ہوگی، اسی درجے کا ہی بندہ کام کرے گا۔ البتہ اگر وہ اعلیٰ درجے کے لوگوں کے کاموں کی نقل اتارے اور ان کی صحبت میں رہے تو اس طرح ان سے سیکھ کر اپنی کمزوریوں کا کچھ مداوا کرسکتا ہے۔ اس طرح سیکھنے کے عمل سے اس کی جبلت کا ایک پہلو بدل جاتا ہے، لیکن بنیادی ساخت نہیں بدلتی۔

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ جو لوگ انسانوں کے رہنما ہوتے ہیں، ان کی ملکیتِ عالیہ اور بہیمیت شدیدہ ہوتی ہے اور وہ یقیناً انبیا علیہم السلام ہوتے ہیں۔ انھیں پر ہی انسان کی ترقی کے لیے قانونِ شریعت اور بہترین ضابطۂ حیات نازل ہوتا ہے۔ ان کی ملکیت ِعالیہ جب اپنی اعلیٰ عقلی استعداد کے ساتھ حظیرۃ القدس اور ملاءِ اعلیٰ سے جڑتی ہے تو ان پر وہاں سے علومِ الٰہیہ نازل ہوتے ہیں، وہ اعلیٰ درجے کا معیاری علم ہوتا ہے۔ پھر ان علوم پر جب عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو عمل کا اعلیٰ ترین معیار بھی انبیا علیہم السلام قائم کرتے ہیں۔ یہ اس علم کی اعلیٰ درجے کی عملی شکل ہوتی ہے اور وہ بہت معیاری عمل ہوتا ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ امام الانبیا ہیں۔ آپؐ کی ملکیت اور بہیمیت باقی تمام انبیا سے بھی اعلیٰ ترین درجے کی ہے۔ ایک روایت کے مطابق حضورؐ میں چالیس طاقت ور مردوں سے زیادہ طاقت تھی۔ (53) آپؐ کی ملکیت کی بلندی کا تو کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد خداوندی ہے: ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ (54) (پھر وہ نزدیک آیا اور اپنی تجلی ڈالی، پس فاصلہ دو کمان کے برابر تھا یا اس سے بھی کم) نبی اکرمؐ میں یہ دونوں قوتیں اعلیٰ ترین درجے پر موجود تھیں۔

انسانی اعمال کی حقیقت اور نوعیت

شاہ صاحبؒ نے انسانی جبلت کی حقیقت واضح کرنے کے بعد انسانی اعمال کی حقیقت اور نوعیت پر ایک بہت خوب صورت بحث کی ہے۔ اس لیے کہ علمِ اسرارِ دین میں جہاں ''احکام'' پر بحث ہے اور نیکی اور بدی کا تعین کرنا ہے، وہاں ''اعمال'' کے خواص اور اُن کے نکات پر بھی بحث کرنا ہے۔ انسانی اعمال کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ ان کے اثرات و نتائج کیا ہوتے ہیں؟ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے اعمال کی پیدائش کے بنیادی اسباب بیان کیے ہیں۔ انسان جب کوئی عمل کرنے پر تیار ہوتا ہے تو اس کے ہر عمل کے پیچھے اس کا ارادہ کارفرما ہوتا ہے۔ ارادہ نہ ہو اور عمل ہو جائے تو ایسا آدمی پاگل اور مجنون یا مجذوب ہوتا ہے۔ دنیا کے قوانین یا علم و فکر کی دنیا میں ایسے لوگوں سے بحث نہیں کی جاتی۔ بحث انھیں پر کی جاتی ہے کہ جو کسی ضابطے میں آ سکتے ہوں۔ انسان کا ارادہ کیسے وجود میں آتا ہے؟ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ خیالات کے مجموعے سے ارادہ وجود میں آتا ہے۔ کسی کام کا خیال آپ کے دماغ میں کئی دفعہ آئے، اس طرح ایک کام کے حوالے سے خیالات کی یلغار آپ کے ذہن پر ہو، یا کسی کام کا شوق آپ کے دماغ میں خیالات کی صورت میں قطار در قطار آ رہا ہے۔ اس مجموعۂ خیالات نے آپ کے عزم کو اُبھارا کہ اس کام کا ارادہ کریں۔

خیالات کی پیدائش کے بنیادی اسباب

انسان کا عمل اس کے ارادے سے پھوٹتا ہے اور ارادہ خیالات کے مجموعے سے وجود میں آتا ہے۔ پھر یہ خیالات کیسے آتے ہیں؟ ان کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے پانچ بنیادی اسباب بیان فرمائے ہیں: 1۔ جبلتِ انسانی، 2۔ مزاجِ طبیعی، 3۔ عادات و اطوار اور گرد و پیش کا ماحول، 4۔ ملاءِ اعلیٰ کی نورانی کیفیت، 5۔ شیطانی اثرات۔

1۔ انسانی جبلت

انسانی جبلت کی حقیقت گزشتہ بیان کی جا چکی ہے، انسان میں خیالات کو ابھارنے والے تمام اسباب میں بنیادی طور پر یہی انسانی جبلت کارفرما ہوتی ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> ''**إعلم! أنّ الخواطر: الّتی یجدها الإنسان فی نفسه، و تبعثهٗ علٰی العمل بموجبها، لا جرم أنّ لها أسبابًا، کسنّة اللّٰه فی سائر الحوادث. و النّظر و التّجربة یظهران أنّ منها ـــ و هو أعظمها ـــ جبلّة الإنسان الّتی خُلق علیها کما نبّه النّبیّ ﷺ فی الحدیث الّذی رویناهٗ من قبل.**'' (55)

(جاننا چاہیے کہ وہ خیالات جو انسان اپنے دل میں پاتا ہے اور جو انسان کو عمل پر ابھارتے ہیں، لازمی طور پر اُن کے کچھ اسباب ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاری ہے کہ تمام حوادث و واقعات کے پیچھے اسباب کارفرما

www.rahimia.org

ہوتے ہیں۔فکر ونظر اور تجربہ یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اُن اسباب میں سب سے بڑا سبب انسان کی وہ جبلت ہے، جس پر وہ پیدا کیا گیا ہے۔جیسا کہ پہلے روایت کی گئی حدیث میں حضورؐ نے متنبہ فرمایا ہے۔)

جب انسانوں کو جبلت کی اساس پر ان اعمال اور قوانین کا مکلّف بنایا گیا ہے تو اسی سے ہی جزا وسزا سامنے آئے گی۔اس لیے کہ انسان میں خیالات پیدا کرنے کا اہم اور بنیادی سبب انسان کی جبلت ہے۔

2۔انسان کے طبعی مزاج کا اثر

انسان میں خیالات پیدا کرنے کا دوسرا سبب انسان کا طبعی مزاج ہے۔انسان کا طبعی مزاج کھانے پینے اور خوراک کے تغیر و تبدل سے بدل جاتا ہے۔شاہ صاحبؒ نے مثال دے کر کہا ہے کہ کوئی آدمی عمدہ اور طاقت ور غذائیں کھائے،تو ظاہر ہے اس میں بھرپور توانائی پیدا ہوگی۔ایسے شخص میں طاقت کا اظہار کرنے والے خیالات ہی آئیں گے۔کسی نے کوئی ہلکی اور سادہ غذا کھائی یا فاقہ اختیار کیا تو اس کے حیوانی خیالات بھی اسی طرح کے کمزور ہوں گے۔اس میں نرم مزاجی سے متعلق خیالات پیدا ہوں گے۔اس طرح خوراک کے اثرات سے طبعی مزاج بدلتا ہے اور اس سے خیالات میں تغیر وتبدل ہوتا ہے۔

3۔ماحول اور عادات کا اثر

ایک اور سبب جس کے ذریعے انسان کے اندر خیالات آتے ہیں، وہ انسان کے گرد و پیش کا ماحول اور عادات ہیں۔انسان اپنے ماحول سے سیکھتا ہے۔انسان کسی انسان کو کوئی کام کرتے دیکھتا ہے تو اس کی نقل اُتارتا ہے۔اس طرح اس کے دماغ میں ایک خیال پختہ ہوتا ہے۔اس خیال کا تسلسل اسے عمل پر اُبھارتا ہے اور مسلسل عمل سے وہ اس کی عادت بن جاتا ہے۔

آج کل تو کاروبار کرنے والی نیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے خیالات کو بدلتی ہیں۔روزانہ ٹی وی پر اشتہارات کے ذریعے سے اپنی پراڈکٹس بیچنے کے لیے ہمارے دماغ میں خواہشات اور خیالات اُنڈیلتی رہتی ہیں۔جس چیز کی ضرورت نہیں بھی ہوتی، وہ بھی خرید کر گھر لے جاؤ۔سرمایہ دارانہ نظام میں اشتہارات کے ذریعے سے خیالات کو کنٹرول کرنے اور خوابوں کو بیچنے کا عمل بڑے عروج پر ہے۔خواب بیچے جاتے ہیں۔خیالات بیچے جاتے ہیں۔

4۔ملاءِ اعلیٰ اور ملاءِ سافل کی قوتوں کے اثرات

چوتھا سبب جو انسانی خیالات پر اثر انداز ہوتا ہے، وہ یہ کہ فرشتے کی طرف سے کسی انسان کے ذہن میں کسی کام کا ایک دم خیال اشـــــراق (روشنی کی چمک) کی صورت میں پہنچا۔اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کوئی ارادہ باندھ لیا۔چناں چہ اعلیٰ ترین درجے کے انسان؛ انبیاؑ اور مجددین اولیاؒ پر ملاءِ اعلیٰ کے خیالات اثر انداز ہوتے ہیں۔اس لیے کہ وہ ان کے زیرِ اثر ہوتے ہیں۔اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ان کی روح ایک لمحے کے لیے بہ طور اشراق ملاءِ اعلیٰ سے جڑتی ہے اور ایک روشن خیال کا کوندا ان کے دماغ میں آتا ہے، اس کے نتیجے میں ایک علم ان کے سامنے منکشف ہوجاتا ہے۔جن لوگوں میں ملکیتِ سافلہ ہوتی ہے، ان پر ملاءِ سافل کی قوتیں اور عالمِ مثال کی زیریں قوتیں اثر انداز ہوتی ہیں۔ان پر ملاءِ سافل کے فرشتوں کی طرف سے کوئی نورانیت بھرا خیال آتا ہے، اس کے زیرِ اثر وہ نیک اعمال کے ارادے باندھتا ہے اور عمل کرتا ہے۔

5۔ شیطانی قوتوں کے اثرات

ملاءِ سافل اور زیریں عالمِ مثال میں فرشتوں کے متوازی شیطانی قوتیں بھی ہیں۔ وہ بھی انسانی دماغ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ شیطانی وسوسے سے کوئی شیطانی خیال دماغ میں آجاتا ہے، انسانوں کو نقصان پہنچانے کا خیال یا کوئی لالچ اور خودغرضی کا خیال ہو۔ پھر شیطانی خیالات کے زیر اثر بھی ارادے وجود میں آتے ہیں، جن کی وَجہ سے غلط اعمال وجود میں آتے ہیں۔ اعمال اور اُن کی جزا و سزا تبھی درست طور پر سمجھ میں آئے گی، جب کہ اعمال کے پیچھے کارفرما خیالات اور ارادے کی پہچان حاصل ہوگی۔

الغرض! اعمال کی جزا و سزا کا تعلق ایک تو نوعِ انسانی کی جبلت سے ہے۔ اسی طرح انسانیت کے لیے مفید خوراک کے بجائے کوئی متصادم خوراک کھائیں گے تو بیمار پڑیں گے۔ یہ بھی سزا ہے۔ اچھی خوراک کھائیں گے جو واقع میں انسانوں کے لیے بنائی گئی ہے تو انسانوں کی ترقی کے لیے انعام اور جزا ہے۔ اسی طرح عاداتِ انسانیہ کی بنیاد پر بھی انسان کی جزا و سزا ہے۔ ایسے ہی اعمال کی جو صورت عالم مثال میں ہے، اس کے لحاظ سے جزا و سزا کے اثرات بھی آپ پر مرتب ہوتے ہیں اور ملاءِ اعلیٰ میں جزا و سزا سے متعلق امور بھی آپ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

انسانی اعمال کے محفوظ رہنے کا نظام

شاہ صاحبؒ نے انسانی اعمال کی پیدائش کے بنیادی اسباب بیان کرنے کے بعد یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اعمال کو انسانی روح میں محفوظ کرنے کا ایک نظام بنایا ہے۔ انسان کے نفسِ ناطقہ اور روح میں مذکورہ بالا پانچ اسباب میں سے کسی سبب کے تحت اعمال کے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان خیالات کے مجموعے سے ارادے بنتے ہیں۔ ارادے کے مجموعے سے اعمال وجود میں آتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے یہاں پر ایک اہم سوال کا جواب دیا ہے۔ کیا کوئی عمل مکمل ہونے کے بعد فنا ہوجاتا ہے یا محفوظ رہتا ہے؟ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ اس پر بھی تمام مذاہب اور فلسفوں کا اتفاق ہے کہ انسان جب عمل کرلیتا ہے تو وہ فنا نہیں ہوتا بلکہ کیا ہوا عمل محفوظ رہتا ہے۔ آج تو سائنس نے بھی ثابت کردیا کہ کوئی آواز یا کوئی عمل آپ نے کسی کمرے میں کیا، آپ وہاں سے چلے بھی جائیں، پھر بھی اسے ریکارڈ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی آواز، گفتگو اور آپ کا عمل بھی محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ جیسے جیسے نئے سائنسی انکشافات سامنے آرہے ہیں تو یہ تمام چیزیں ثابت ہورہی ہیں۔ شاہ صاحبؒ کے نزدیک عمل اور خُلق کے محفوظ رہنے کا یہ نظام چار مرحلہ وار درجات پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''**إعلم! أنّ الأعمال الّتی یقصدها الإنسان قصداً مؤکّداً، و الأخلاق الّتی هی راسخة فیه تنبعث من أصل النّفس النّاطقة، ثمّ تعود إلیها، ثمّ تتشبّث بذیلها، و تحصٰی علیها.**[56]

(جاننا چاہیے کہ وہ اعمال جنھیں انسان اپنے پختہ قصد اور ارادے سے کرتا ہے، اور وہ اَخلاق جو انسان میں پختہ ہوچکے ہیں؛ (۱) یہ نفسِ ناطقہ کی اصل سے پھوٹتے ہیں۔ (۲) پھر اسی نفس کی طرف لوٹتے ہیں۔ (۳) پھر اس کے دامن کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہیں۔ (۴) پھر ان کے حساب و کتاب کے مطابق جزا و سزا دی جاتی ہے۔)

www.rahimia.org

1۔ عمل کی پیدائش

سب سے پہلے انسان کے نفسِ ناطقہ سے عمل پھوٹتا ہے، جیسا کہ گزشتہ بحث سے ثابت ہوا کہ ملکیت اور بہیمیت اور اُن میں تصالح یا تجاذب کی بنیاد پر وجود میں آنے والی انسانی جبلت، طبعی مزاج کا غلبہ، فرشتوں یا شیطانوں کے زیرِ اثر خیالات بنتے ہیں۔ ان سے عزائم اور ارادے وجود میں آتے ہیں اور پھر اس کے نتیجے میں انسانی روح سے عمل کی پیدائش ہوتی ہے۔

2۔ عمل کا انسانی روح کی طرف لوٹنا

جب کوئی عمل بار بار اور کثرت سے کیا جاتا ہے تو اس کی عادت بن جاتی ہے۔ یوں انسان اسے مسلسل دہراتا رہتا ہے۔ جیسے کسی انسان کو مسلسل نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے سے اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اس طرح انسانی روح اس عمل سے متأثر ہوتی ہے اور اس کا رنگ قبول کرلیتی ہے۔ اسی طرح کوئی انسان مسلسل گاڑی چلائے تو اسے اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اس طرح ایک بڑا ماہر ڈرائیور بنتا چلا جائے گا۔ اس دنیا میں جو عمل بھی آپ کرتے رہیں، وہ آپ کی عادت بن جاتی ہے۔ یہ عادات و مألوفات انسان کے خیالات پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں پھر نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں تو اس طرح ایک سرکل (circle) شروع ہوجاتا ہے۔ یوں آپ کے نفس میں اس عمل کی ایک خاص ہیئت اور شکل بن جاتی ہے۔

www.rahimia.org

3۔ عمل کی انسانی روح کے دامن سے وابستگی

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کی روح کی تختی کسی عمل کے بغیر صاف شفاف ہوتی ہے۔ کسی عمل کا کوئی رنگ اس کی روح پر نہیں ہوتا۔ پھر جیسے ہی وہ عمل کرنا شروع کرتا ہے تو اس کے اعمال ایک زنجیری ترتیب کے ساتھ اُس کی روح میں اپنا رنگ ظاہر کرنے لگتے ہیں۔ ہر پہلے والا عمل دوسرے والے عمل کے لیے سبب بنتا ہے۔ اس طرح اعمال کا سلسلہ بہ سلسلہ مرتب انداز آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یوں ہر عمل انسانی روح کے دامن سے وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس سے استثنیٰ صرف اُسی صورت میں ہوسکتا ہے جب اعمال پر اُکسانے والی قوت کسی مرض یا بڑھاپے کے سبب کمزور ہوجائے یا بالائی نظام کی کوئی طاقت اسے توڑ دے، جیسا کہ کوئی آدمی مسلمان ہوجائے تو ایمان کی طاقت سے کفر کے اعمال کا تسلسل ٹوٹ کر فنا ہوجاتا ہے۔ پھر ایمانی کیفیت سے متعلق اعمال کا ایک تسلسل انسانی روح کے دامن کے ساتھ وابستہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

4۔ محفوظ اعمال کی بنیاد پر حساب و کتاب اور جزا و سزا

اعمال کا چوتھا مرحلہ ان کا ایک کتاب میں محفوظ ہونا ہے۔ اس حوالے سے ارشادِ خداوندی ہے:

وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ (57)

(مجرم کہیں گے کہ افسوس ہم پر! یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ اس نے کوئی چھوٹی اور بڑی بات نہیں چھوڑی، مگر سب کو محفوظ کیا ہوا ہے۔ اور جو کچھ انھوں نے کیا تھا، سب کو موجود پائیں گے۔)

نبی اکرم ﷺ نے حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے ارشادِ خداوندی نقل کیا ہے:

''إنّما هی أعمالكم أُحصيها عليكم، ثمّ أُوفّيكم إيّاها، فمن وجد خيراً فيحمد الله، و من وجد

غیر ذٰلک فلا یلومنّ إلاّ نفسه.'' (58)

(یہ تمھارے ہی اعمال ہیں، میں نے انھیں تمھارے واسطے محفوظ کیا ہے۔ پھر میں تمھیں ان کا پورا پورا بدلہ دوں گا۔ پس جو اپنے لیے بھلائی پائے تو اُسے چاہیے کہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جو اس کے علاوہ دوسرا نتیجہ پائے تو کسی اَور کو ملامت کرنے کے بجائے اپنے نفس کو ملامت کرے۔)

اس آیت اور حدیث میں بیان کردہ اعمال کے محفوظ ہونے کی صحیح نوعیت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''أمّا الإحصاء علیها فسرّهٗ — علٰی ما وجدّتهٗ بالذّوق — أنّ فی الحیّز الشّاهق تظهر صورة لکلّ إنسان بما یعطیه النّظام الفوقانی، و الّتی ظهرت فی قصّة المیثاق شعبة منها، فإذا وُجدت هٰذا الشّخص انطبقت الصّورة علیه، و اتّحدت معهٗ؛ فإذا عمل عملاً انشرحت هٰذه الصّورة بذٰلک العمل انشراحاً طبیعیاً بلا اختیار منهٗ.'' (59)

(انسانی روح میں اعمال کے محفوظ کرنے کا راز — جیسا کہ میں نے اپنے ذوق سے معلوم کیا ہے — یہ ہے کہ کائنات (میں عالم مثال) کے بلند ترین مقام میں ہر انسان کی ایک مخصوص شکل وصورت بالائی نظام کی طرف سے عطا ہوتی ہے۔ انسان کی وہ صورت جو ''میثاقِ الست'' کے قصے میں ظاہر ہوئی تھی، اسی کا ایک شعبہ ہے۔ یہ انسان جب دنیا میں وجود میں آتا ہے تو عالمِ مثال میں متعین اس کی یہ صورت اس کے وجود پر منطبق اور اس کے ساتھ متحد ہوجاتی ہے۔ یہ شخص جب دنیا میں کوئی عمل کرتا ہے تو اس صورت میں طبعی طور پر انشراح کی کیفیت بے اختیار طاری ہوتی ہے۔)

اس دنیا میں کیے گئے اعمال عالمِ مثال میں موجود اُس کی روح کے ساتھ متصل (attach) ہوجاتے ہیں۔ اب اگر وہ عمل صحیح ہوتو اس کے نتیجے میں وہ روح طبعی طور پر خوش ہوتی ہے کہ اس کا اچھا نتیجہ اور اچھی جزا آئے گی۔ اگر وہ عمل صحیح نہیں ہوتا تو اس روح پر انقباض کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسی لیے آپ اچھا عمل کرتے ہیں تو آپ کے دل کو ایک سکون ملتا ہے اور اُنس و طمانیت ملتی ہے۔ مثلاً آپ کسی کی خدمت کرتے ہیں یا کسی کے ساتھ دو چار اچھے جملے بولتے ہیں، تو دراصل آپ کے اصل انسان کی خوشی کے اثرات آپ پر ظاہر ہورہے ہیں۔ جب آپ کوئی بُرا کام کرتے ہیں تو آپ کا اپنا ضمیر ملامت کررہا ہوتا ہے کہ یہ کام میں نے صحیح نہیں کیا۔ کسی عمل کے نتیجے میں خوشی اور ملامت کے اثرات دراصل اُس روح کی صورت کے ساتھ جو عمل کا تعلق پیدا ہوا ہے، اس کے اثرات ونتائج ہیں۔ روح میں محفوظ ان اعمال کا مجموعی نتیجہ آخرت میں ظاہر ہوگا۔

انسان کے اعمال اور اَخلاق کا باہمی ربط

انسان جب اعمال کرلیتا ہے تو ظاہری طور پر اس کا جسم عمل سے فارغ ہوگیا۔ لیکن اس عمل کا ایک خاص اثر اور نتیجہ انسان کی روح اور اس کے نفس پر ہوتا ہے۔ پہلی دفعہ تو آپ کو بے شک باہر سے خیال آیا اور آپ نے وہ عمل کرلیا مگر عمل کرنے کے بعد آپ کے اندر اس عمل کے اثرات محفوظ ہوجاتے ہیں، جو کسی دوسرے وقت اسے دوبارہ اس عمل پر اُکساتے ہیں۔ یہ عمل جب آپ بار بار کرتے ہیں تو اس کے نتیجے میں روح میں ایک ملکہ پیدا ہوتا ہے، جسے ''خُلق'' یا ''ہیئتِ نفسانیہ'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل کئی دفعہ کیے گئے اعمال کا مجموعی نتیجہ ''ملکہ'' کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ خُلق انسان کی روح میں باہر سے کہیں نہیں آیا۔ یہ

www.rahimia.org

ہے اَخلاق اور اعمال کا باہمی ربط۔ یہ اَخلاق دراصل ہمارے ہی کیے ہوئے اعمال کا مجموعہ یا ملکہ اور خلاصہ ہوتا ہے، جو ہماری روح کے اندر موجود اور محفوظ ہوتا ہے۔ اس طرح اعمال اَخلاق کو وجود میں لانے کا ذریعہ بنتے ہیں اور پھر اَخلاق انسان کو دوبارہ انھی اعمال پر اُکساتے ہیں۔ یوں اچھے اعمال کے مجموعے سے اچھے اَخلاق وجود میں آتے ہیں اور بُرے اعمال کے مجموعے سے بُرے اَخلاق وجود میں آتے ہیں۔

انسانیت کی ترقی کے لیے ارتفاقاتِ اربعہ کی اہمیت

شاہ صاحبؒ نے کائنات کی حقیقت، اس میں انسان کی جبلت اور اس کے اعمال کی صحیح نوعیت بیان کرنے کے بعد ایک مبحث میں جزا و سزا پر مشتمل قانونِ مجازات بیان کیا ہے، جس کی کچھ تفصیل ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں۔ اس کے بعد شاہ صاحبؒ نے ایک مبحث میں ارتفاقات کی بحث کی ہے۔ چناں چہ تیسرے مبحث میں ''ارتفاقات'' کی بحث میں یہ واضح کیا ہے کہ انسان اپنی شخصی اور عائلی زندگی سے لے کر اجتماعیت کے بین الاقوامی مرحلے تک چار ارتفاقات سے گزرتا ہے۔ انسانیت کی تکمیل کے لیے ارتفاقاتِ اربعہ کی ضرورت ہے۔ اگلے روز کا لیکچر انھی ارتفاقات کی تفصیل و تشریح پر مشتمل ہے۔ اس لیے اس وقت اسے چھوڑتے ہوئے اَخلاقِ اربعہ کے حوالے سے گفتگو پیش خدمت ہے۔

انسانیت کی تکمیل کے لیے اَخلاقِ اربعہ کی اہمیت

شاہ صاحبؒ نے ارتفاقات کے بعد ایک مبحث میں انسانیت کی حقیقی کامیابی اور سعادت سے متعلق گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انسانی روح کی تکمیل کے لیے چار اَخلاق کی ضرورت ہے۔ انسانیت کے لیے یہ چار اَخلاق بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اَخلاق کا اظہار اُس کے ارتفاقات میں ہونا چاہیے اور ان اَخلاق کے اظہار سے اس کی روح کی تکمیل بھی ہوتی ہے۔ ان چار اَخلاق پر دنیا بھر کے تمام مذاہب اور تمام ملتوں میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ کوئی ان کا انکار نہیں کرتا۔ سب اس بات پر متفق ہیں کہ انسانیت کے چار بنیادی اَخلاق ہیں: ۱۔ طہارت، ۲۔ اِخبات، 3۔ سماحت، 4۔ عدالت۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ تہذیبِ نفس کے حوالے سے ان چار اَخلاق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''اَنّی فَهَّمَنِیَ اللّٰهُ تَعَالٰی بِفَضْلِهٖ اَنَّ مَرْجِعَهَا اِلٰی خِصَالٍ اَرْبَعٍ ، تَتَلَبَّسُ بِهَا الْبَهِیْمِیَّةُ مَتٰی غَطَّتْهَا النَّفْسُ النُّطْقِیَّةُ ، وَ قَسَرَتْهَا عَلٰی مَا یُنَاسِبُهَا ، وَ هِیَ اَشْبَهُ حَالَاتِ الْاِنْسَانِ بِصِفَةِ الْمَلَإِ الْاَعْلٰی ، مُعِدَّةٌ لِلْحُوقِهٖ بِهِمْ ، وَ انْخِرَاطِهٖ فِیْ سِلْکِهِمْ، وَ فَهَّمَنِیْ اَنَّهٗ اِنَّمَا بُعِثَ الْاَنْبِیَاءُ لِلدَّعْوَةِ اِلَیْهَا ، وَ الْحَثِّ عَلَیْهَا ، وَ اَنَّ الشَّرَائِعَ تَفْصِیْلٌ لَهَا ، وَ رَاجِعَةٌ اِلَیْهَا. (60)

(اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل سے یہ بات سمجھائی ہے کہ تمام تر نیکیوں کا منبع چار بنیادی عادات اور اَخلاق ہیں۔ انسان کی قوتِ بہیمیہ ان اَخلاق سے اُس وقت رنگین ہوتی ہے، جب نفسِ ناطقہ کی قوتِ ملکیہ اُس پر غالب آجاتی ہے اور اُسے کھینچ کر اپنے مناسب اعمال کی طرف لے جاتی ہے۔ انسان کی یہ چار خصلتیں اور اَخلاق ملاءِ اعلیٰ کے اوصاف کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ اَخلاق انسان کو ملاءِ اعلیٰ کی صف میں شامل کرنے

www.rahimia.org

اور اُن کی لڑی میں پرونے کا سبب بنتے ہیں۔ نیز اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے یہ بات بھی سمجھائی ہے کہ انبیا علیہم السلام کی بعثت انھی چار اَخلاق کی دعوت دینے اور ان پر اُبھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور ان پر نازل ہونے والی شریعتیں انھی چار اَخلاق کی تفصیلات ہیں۔ ان کا نتیجہ یہی چار اَخلاق ہیں۔)

1۔ طہارت کا خُلق

پہلا خُلق طہارت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان پاکیزگی چاہتا ہے۔ صفائی ستھرائی چاہتا ہے۔ خاص طور پر جب بھی وہ دوسرے انسانوں کے سامنے آتا ہے، اپنے جسم اور لباس کو صاف ستھرا بناتا ہے۔ پاکیزگی اس کی طبیعت کا حصہ ہے۔ طہارت کی ضد گندا رہنا ہے۔ پراگندہ بال، لباس کا میلا کچیلا ہونا، بال بکھرے ہوئے ہوں۔ یہ حیوانیت کی علامات ہیں۔ انسان کی کامیابی کا پہلا معیار طہارت ہے۔ طہارت انسان کے لیے ہر مذہب میں ضروری ہے، حتیٰ کہ ایک دہریہ بھی صبح اٹھ کر ہاتھ منہ ضرور دھوتا ہے۔ اگرچہ سردی کے موسم میں پورے جسم کا غسل نہ بھی کرے، تو کم از کم چہرہ اور ہاتھ ضرور دھوتا ہے۔

یہ طہارت دنیا بھر کے تمام مذاہب، فلسفوں اور ملتوں کا متفقہ قاعدہ اور ضابطہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ طہارت کے طریقے ہر ایک مذہب نے اپنے اپنے طے کیے ہوئے ہیں۔ طہارت کا جامع اور بہترین طریقہ دینِ اسلام میں ہے۔ کس وقت کون سی گندگی یا حدث لاحق ہو تو کس درجے کی طہارت ضروری ہے۔ کس ناپاکی میں غسل ضروری ہے اور کس ناپاکی میں وضو ہی کافی ہے۔ چناں چہ جسم کے چاروں اطراف، یعنی دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں اور چہرے کا دھونا اور سر پر مسح حدثِ اصغر میں کافی ہے۔ حدثِ اکبر کی صورت میں غسل ضروری ہے۔ وضو اور غسل سے انسان میں ایک خاص نورانیت پیدا ہوتی ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''**و الطّهارة أشبه الصّفات النّسمية بحالات الملاء الاعلٰى فى تجرّدها عن الألواث البهيمية و ابتهاجها عندها من النّور و لذٰلک كانت معدّة لتلبّس النّفس بكمالها بحسب القوّة العملية.**'' (61)

(انسانی روح کی صفات میں طہارت سب سے زیادہ ملاءِ اعلیٰ کے حالات کے ساتھ مشابہت رکھنے والا خُلق ہے۔ کیوں کہ اس حالت میں وہ حیوانی گندگیوں سے پاک ہو جاتا ہے اور نورِ طہارت کی وَجہ سے وہ خوشی اور سرور محسوس کرتا ہے۔ یہی وَجہ ہے کہ طہارت کے سبب انسان اپنی قوتِ عملیہ کے اعتبار سے اعلیٰ کمال حاصل کرنے کے لیے ایک دم تیار ہو جاتا ہے۔)

2۔ اِخبات الی اللہ کا خُلق

دوسرا بنیادی خُلق ''اِخبات الی اللہ'' ہے، یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری کرنا ہے۔ اسلام کے سوا باقی دیگر مذاہب میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ چناں چہ الٰہی مذاہب میں تو یقیناً خدا کے سامنے عجز و انکساری کا اقرار ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ جو غیر الٰہی مذاہب ہیں، وہ اگرچہ ایک زمانے سے مسخ ہو چکے ہیں، ان کے ہاں بھی اپنے خیال کے مطابق کسی نہ کسی خدا، God، برہما وغیرہ کے عنوان سے ایک تصور موجود ہے۔ مرورِ زمانہ سے اگرچہ اُس کی جگہ دیوی دیوتاؤں نے لے لی ہے، لیکن اصل میں تو اُن کے دماغ میں جو بنیادی چیز ہے، وہ کسی نہ کسی ذات کے سامنے جھکنے اور انکساری کے اظہار

کی ہے۔ اور تو اَور دہریہ بھی جہاں اُس کی عقل جواب دے جائے تو وہ کسی نہ کسی سپیریئر (Superior) طاقت کو مانتا ہے۔ چاہے وہ آئن سٹائن (1955ء) سے متأثر ہو یا نیوٹن (1727ء) سے، یا آج گریوی ٹیشنل ویوز (Gravitational Waves) کا مشاہدہ کرنے والے کسی سائنس دان کی بات ہو، کہیں نہ کہیں آ کر اُس کا دماغ عجز و انکساری کو ضرور تسلیم کرتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے عجز و انکساری کرنا ''اخبات'' ہے۔ اس کے اظہار کا جامع ترین طریقہ اور اس کا ایک مکمل اور مربوط نظام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے توحیدِ الٰہی کی اساس پر بیان کیا ہے۔ آپؐ نے توحید پر عمل کرنے کا ایک مکمل نظام نماز روزہ وغیرہ عبادات کی عملی صورت میں متعین کر دیا ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''وَ هٰذِهِ الْحَالَةُ اَقْرَبُ الْحَالَاتِ النّسَمِيَّةِ ، وَ أَشْبَهُهَا بِحَالِ الْمَلَأِ الْاَعْلٰى فِيْ تَوَجُّهِهَا اِلٰى بَارِئِهَا ، وَ هَيَمَانِهَا فِيْ جَلَالِهٖ ، وَ اسْتِغْرَاقِهَا فِيْ تَقْدِيْسِهٖ ، وَ لِذٰلِکَ كَانَتْ مُعِدَّةً لِخُرُوجِ النَّفْسِ اِلٰى كَمَالِهَا الْعِلمِيّ ، اَعْنِـي انْتِقَاشَ الْمَعْرِفَةِ الْاِلَٰهِيَّةِ فِي لَوْحِ ذِهْنِهَا ، وَ اللُّحُوقَ بِتِلْکَ الْحَضْرَةِ بِوَجْهٍ مِنَ الْوُجُوهِ وَ اِنْ كَانَتِ الْعِبَارَةُ تَقْصُرُ عَنْهُ.'' (62)

(انسانی روح میں اِخباتِ الی اللہ کی حالت ملاءِ اعلیٰ سے سب سے زیادہ قریب اور سب سے زیادہ مشابہت رکھنے والی حالت ہے۔ ایسی حالت میں وہ اپنے خالق و مالک کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کی عظمت و جلال کی کیفیت اور اس کے مقدس مقام میں استغراق کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ اس حالت کے سبب انسانی نفس میں اعلیٰ علمی کمال حاصل کرنے کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ اس کے ذہن کی تختی پر اس سے معرفتِ الٰہیہ کا نقش بیٹھ جاتا ہے اور اسے ذاتِ باری تعالیٰ کے حضور میں کسی نہ کسی پہلو سے باریابی مل جاتی ہے۔ اگرچہ زبان اس کی حقیقت بیان کرنے سے قاصر ہے۔)

3۔ سماحت کا خُلق

تیسرا بڑا بنیادی خُلق ''سماحت'' ہے۔ سماحت کی تعریف کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و السّماحة هيئة تمنع الإنسان من أن يتمكّن منهٗ ضدّ الكمال المطلوب علماً و عملاً.'' (63)

(سماحت ایک ایسا خُلق ہے جو انسان کو علمی اور عملی طور پر اپنے مطلوبہ کمالات کے مخالف اعمال سے دور رہنے کی طاقت اور قوت پیدا کرتا ہے۔)

ہر انسان عزت و وقار چاہتا ہے۔ وہ اپنی توہین (insult) برداشت نہیں کرتا۔ اُس میں ایک وقار کی بلندی ہوتی ہے۔ وہ اپنے اندر عظمت رکھتا ہے۔ ہر صاحبِ سماحت (باوقار شخص) اپنی عزت و وقار کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے لیے قاعدے ضابطے بنائے جاتے ہیں۔ غیبت کرنا، کسی پر بہتان لگانا، یہ دراصل اُس کی عزت کو مجروح کرنے والے اعمال ہیں۔ آزادی اور حریت، عفت، سخاوت، ہمدردی، صبر، جدوجہد، عفو و درگزر، قناعت اور تقویٰ کو شاہ صاحبؒ نے سماحت کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

4۔ عدالت کا خُلق

چوتھا اور اہم ترین خُلق ''عدالت'' ہے۔ اس کی تعریف اور حقیقت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

www.rahimia.org

''العدالة، وهي مَلَكة في النّفس، تصدر عنها الأفعال الّتي يقام بها نظام المدينة و الحيّ بسهولة، و تكون النّفس كالمجبول علىٰ تلك الأفاعيل.'' (64)

(عدالت یہ ہے کہ انسان میں ایک ایسا ملکہ پیدا ہوجائے کہ جس سے وہ ایسے اعمال کرے کہ کسی ملک اور قبیلے کا نظام سہولت کے ساتھ ٹھیک ہوجائے۔ ملکۂ عدالت انسانی نفس میں کچھ اس طرح پختہ ہوجائے، گویا کہ وہ ان عدل و انصاف پر مبنی کاموں کو فطری طور پر سرانجام دے رہا ہے۔)

یہ بات سمجھنے کی ہے کہ ہر انسانی سماج میں سماجی معاہدات ہوتے ہیں۔ ایسا کوئی معاشرہ نہیں ہوتا، جس میں سماجی معاہدات نہ ہوں۔ گھریلو معاشرتی زندگی بھی ایک معاہدے کے تحت وجود میں آتی ہے۔ معاہدۂ نکاح کے تحت دو خاندانوں کے درمیان سماجی تعلق اور خاندانی نظام وجود میں آتا ہے۔ خرید و فروخت کے معاہدات کی اساس پر بازار کا نظام قائم ہوتا ہے۔ اسی سماجی اور عمرانی معاہدے (Social Contract) کی اساس پر قومی سیاسی، معاشی اور سماجی نظام بھی بنتا ہے۔ آئینی، قانونی اور عدالتی ڈھانچہ بھی عمرانی معاہدے پر استوار ہوتا ہے۔ سیکیورٹی فورسز کا نظام بھی اُسی سماجی معاہدے کے ذیل میں آتا ہے۔ پھر ممالک اور اقوام کے درمیان بین الاقوامی معاہدات بھی ہوتے ہیں۔

ان تمام معاہدات میں بہرحال دو یا دو سے زائد فریق ہوتے ہیں۔ ان فریقین کے درمیان جو بھی معاہدہ ہو، اس کی ممکنہ شکلیں دو ہی ہیں: (۱) عدل اور (۲) ظلم۔ اس معاہدے میں دونوں فریقین کی حیثیت برابر ہے تو اس کو ''عدل'' کہیں گے۔ اگر دونوں فریقین کی حیثیت برابر نہیں ہے، ایک کا پلڑا بھاری اور دوسرے کا پلڑا ہلکا ہے تو اس کو ''ظلم'' کہیں گے۔

شاہ صاحبؒ نے کہا ہے کہ تمام انسانیت اس پر متفق ہے کہ تمام سماجی معاہدات میں عدالت بنیادی خُلق ہے۔ عدالت کی تشریح شاہ صاحبؒ نے یہ کی ہے کہ یہ ایک ایسا ملکہ (capability) ہے کہ جس کے ذریعے سے کسی مملکت کا نظامِ انصاف کی بنیاد پر درست طریقے سے قائم کرنے کی اہلیت، صلاحیت اور مہارت پیدا ہوجائے۔ یہ محض انفرادی عدل نہیں کہ ایک آدمی دوسرے کے ساتھ اچھے اَخلاق کا مظاہرہ کرے، بلکہ انسانی معاشرے میں عدل کے اصولوں پر مملکت کا بہترین سسٹم بنانا ملکہ عدالت ہے۔

اَخلاقِ اربعہ کے راستے میں حجابات اور اُن کا علاج

شاہ صاحبؒ نے انسانی فطرت کے بنیادی اَخلاقِ اربعہ کی نشان دہی کرنے کے بعد اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ ان اَخلاق کے حاصل کرنے میں تین بنیادی حجابات ہیں۔ اس کی نشان دہی کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''إعلم! أنّ معظّم الحُجُب ثلاثة: حجاب الطّبع، و حجاب الرّسم، و حجاب سوء المعرفة.'' (65)

(جاننا چاہیے کہ (انسانی فطرت میں اَخلاق کے حصول کے) بڑے حجابات تین ہیں:

(۱) طبیعتِ انسانی کا حجاب، (۲) ماحول اور رسم و رواج کا حجاب، (۳) غلط اور بدفہمی کا حجاب۔)

1۔ طبیعتِ انسانی کا حجاب

قوتِ بہیمیہ کے غلبے سے کھانے پینے اور شادی بیاہ جیسے امور کسی انسان پر غالب آجاتے ہیں۔ اس کا دل طبعی حالات جیسے

www.rahimia.org

خوشی غمی، غصہ اور شرمندگی وغیرہ سے متأثر ہوتا ہے۔ اگر انسان ہمہ وقت انھی کاموں میں مشغول رہے اور اس کی علمی اور عملی صلاحیتیں صرف نفسانی تقاضوں کو پورا کرنے میں ہی مشغول رہیں، کسی اعلیٰ انسانی خُلق کے حصول کی طرف متوجہ نہ ہوں تو اسے ''حجابِ طبع'' یا ''حجابِ نفس'' کہا جاتا ہے۔

2۔ دنیاوی رسومات کا حجاب

کوئی انسان قوتِ بہیمیہ کے طبعی تقاضوں سے بسا اوقات بلند ہوجاتا ہے۔ اس کی عقلی اور عملی قوتیں ایسی صورت میں جب اپنے گرد و پیش کی رسومات اور اپنی قوم کے ارتفاقات کی طرف متوجہ ہوتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں اس کے دل میں اپنی قومی رسومات کی عظمت بیٹھ جاتی ہے اور وہ اُن کا اسیر بن کر رہ جاتا ہے۔ گرد و پیش کا ماحول اور نظام پست عادات اور بداَخلاقی پر ہی مبنی ہوتو وہ اس سے اوپر اٹھ کر اعلیٰ علمی، عقلی اور عملی صلاحیتوں کا مظاہرہ نہیں کر پاتا۔ وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول کے دباؤ کا مقابلہ کرنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ اس طرح اپنی قومی رسومات کا نظام اس پر غالب آ جاتا ہے۔ اسے ''حجابِ رسم'' یا ''حجابِ دنیا'' کہا جاتا ہے۔

3۔ علم کی صحیح معرفت نہ ہونے کا حجاب

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنی قومی رسومات کے ماحول کے دائرے سے کچھ بلند ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ذہانت کے سبب کسی عقلی دلیل یا کسی خطابی انداز و اُسلوب یا کسی نبی کی شریعت کی تقلید کرتے ہوئے اعلیٰ اَخلاق کو سمجھنے کی استعداد حاصل کرلیتے ہیں۔ اس طرح ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان میں بعض لوگ درست طور پر بات سمجھ نہیں پاتے۔ وہ بدفہمی اور سوءِ فہم کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اسے ''**حجابِ سوءِ معرفت**'' کہا جاتا ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ان حجابات کو دور کرنے کے طریقے شریعت نے بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

نیکی اور بدی کی جامع تعریف اور اس کے بنیادی اصول

شاہ صاحبؒ نے گزشتہ چار مباحث میں کائنات کی حقیقت، انسان کی حقیقی تعریف، مجازات کا قانون، ارتفاقاتِ اجتماعی اور انسانیت کے چار بنیادی اَخلاق بیان کرنے کے بعد پانچویں مبحث میں ''برّ و اِثم'' یعنی نیکی اور بدی کی صحیح تعریف اور حقیقت بیان کی ہے۔ معاشروں کے لیے تشکیل دیے گئے قوانین اور شرائع کی اساسیات نیکی اور بدی کے تصورات پر قائم ہیں۔ دنیا میں ہر مذہب اور سکول آف تھاٹ انسان کے لیے دیے گئے احکامات کو نیکی کہتا ہے۔ اور اپنے خیال کے مطابق بُرائی سے روکتا ہے۔ لیکن جب تک نیکی اور بدی کی صحیح اور حقیقی تعریف سامنے نہ ہوتو احکامات کے صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے شاہ صاحبؒ نے گزشتہ تمام بحثوں کے بعد برّ و اِثم یعنی نیکی اور بدی کی تعریف کی ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''و قد ذكرنا لِمّيّة المجازات و إنّيّتها، ثمّ ذكرنا الارتفاقات الّتي جُبل عليها البشر، فهي مستمرّة فيهم لا تنفكّ عنهم، ثمّ ذكرنا السّعادة و طريق اكتسابها: حان أن نشتغل بتحقيق معنىٰ البرّ و الإثم، فالبِرّ:

(١) كُـلّ عمل يفعلهُ الإنسان قضيّةً لانقيادهِ للملاءِ الأعلىٰ، و إضمحلالهِ فى تلقّى الإلهام من اللّٰه، و صيرورته فانياً فى مراد الحقّ.

(٢) و كلّ عمل يجازىٰ عليه خيراً فى الدّنيا أو الآخرة.

(٣) و كلّ عمل يصلح الارتفاقات الّتى بُنى عليها نظام الإنسان.

(٤) و كلّ عمل يفيد حالة الانقياد و يدفع الحُجُب.'' (66)

(ہم نے پہلے قانونِ مجازات کے بنیادی دلائل بیان کیے، پھر ہم نے انسانیت کے فطری ارتفاقات بیان کیے۔ یہ ارتفاقات ہمیشہ انسانیت میں جاری رہتے ہیں۔ وہ ان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ پھر ہم نے انسان کی کامیابی کے چار بنیادی اَخلاق اور اُن کے حاصل کرنے کا طریقہ بیان کیا۔ اب ہم بِر اور اِثم کے معنی کی تحقیق میں مشغول ہوتے ہیں۔ انسانیت کے لیے بِر اور نیکی کا درجِ ذیل چار دائروں میں ہونا ضروری ہے:

(۱) ہر وہ عمل جسے انسان ملاءِ اعلیٰ کی فرماں برداری کو پورا کرنے کے لیے سرانجام دے۔ اور اللہ کی جانب سے ہونے والے الہام اور احکامات پورے کرنے میں انتہائی جدوجہد اور کوشش کرے۔ اور حق تبارک و تعالیٰ کی مُراد میں اپنے آپ کو فنا کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔

(۲) ہر وہ عمل جس کا دنیا میں یا آخرت میں اچھا بدلہ ملے۔

(۳) ہر وہ عمل جس سے انسانی معاشروں کے لیے قائم نظام کے بنیادی ارتفاقات درست ہوں۔

(۴) ہر وہ عمل جو اَخلاقِ اربعہ (طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت) کے حوالے سے فرماں برداری کی حالت کے لیے مفید ہو اور اس سے تینوں حجابات (حجابِ طبع، حجابِ رسم اور حجابِ سوءِ معرفت) دور ہوتے ہوں۔)

اسی طرح شاہ صاحب اِثم اور بدی کی تعریف کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''و الإثمُ:

(١) كُلّ عمل يفعلهُ الإنسان قضيّة لانقيادهِ للشّيطان، و صيرورتهِ فانياً فى مُرادهِ.

(٢) و كُلّ عمل يُجازىٰ عليه شرّاً فى الدّنيا أو الآخرة.

(٣) و كُلّ عمل يفسد الارتفاقات.

(٤) و كُلّ عمل يُفيد هيئة مضادّةً للانقياد و يؤكّد الحُجُب.'' (67)

(گناہ:

(۱) ہر وہ عمل جسے انسان شیطان کی فرماں برداری کو پورا کرنے کے لیے سرانجام دیتا ہے اور اس کی مراد کو پورا کرنے کے لیے فنا ہو جاتا ہے۔

(۲) ہر وہ عمل جس کا دنیا یا آخرت میں بُرا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔

(۳) ہر وہ عمل جو ارتفاقات کے نظام کو توڑتا اور انھیں خراب کرتا ہے۔

www.rahimia.org

(۴) ہر وہ عمل جو اَخلاقِ اربعہ کے متضاد ہیئتِ نفسانی کے لیے مفید ہے اور تینوں حجابات کو پختہ کرتا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے نیکی اور بدی کو عمل میں لانے کے بھی بنیادی قاعدے اور ضابطے بتائے ہیں۔ چناں چہ انسانیت کی ترقی کے لیے برّ کے بنیادی اصولوں؛ توحید، رسالت، فرشتوں پر ایمان اور طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کو حکمۃ البِرّ کے تحت تفصیلاً بیان کیا ہے۔ اسی طرح اِثم کے طبقات اور اس کی بنیادی اقسام اور مفاسد کی بھی نشان دہی کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق کے لیے شعائرِ اربعہ کی اہمیت

برّ اور نیکی کے بنیادی اصولوں میں توحیدِ الٰہی کا اقرار اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تسلیم کرنا ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے لیے ایسے ظاہری اور محسوس امور کی ضرورت ہوتی ہے کہ جنھیں دیکھ کر اللہ کی یاد آئے اور اُس کی عظمت دل میں پیدا ہو۔ انھیں ''شعائر اللہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ تمام انسانوں کی اجتماعی حالت ان شعائر اللہ کے ذریعے سے درست ہو۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

''**لیس المقصود بالذّات فی العنایة التّشریعیة حال فردٍ بل حال جماعة، کأنّها کُلّ النّاس و للّٰه الحُجّة البالغة، و معظّم شعائر اللّٰه أربعة: القرآن، و الکعبة، و النّبی، و الصّلوٰة.**'' (68)

(اللہ تعالیٰ کی ایسی عنایت اور مہربانی جو انسانوں کے لیے شریعت مقرر کرتی ہے، اس میں کسی ایک فرد کی حالت ذاتی طور پر مقصود نہیں ہوتی، بلکہ کل انسانیت پر مشتمل انسانی جماعت کی حالت درست کرنا پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اور یہ اللہ کی بہت بڑی حجت ہے (اس لیے اللہ نے شعائر مقرر کیے ہیں)۔ اور اللہ کے بڑے شعائر چار ہیں: (۱) قرآن، (۲) کعبہ، (۳) نبی (۴) اور نماز۔)

ان چار شعائر کے حوالے سے حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے علوم کے شارح امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ انسان کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک نصابِ تعلیم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ قرآن حکیم ہے۔ نصابِ تعلیم کے پڑھانے کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ خانۂ کعبہ ہے اور کعبہ کے رُخ پر بننے والی دنیا بھر کی تمام مسجدیں ہیں۔ وہ اس تعلیم و تربیت کا مرکز ہیں۔ نصابِ تعلیم کو پڑھانے کے لیے ایک معلّم کی ضرورت ہوتی ہے۔ چناں چہ وہ معلمِ انسانیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس تعلیم کا عمل یعنی پریکٹیکل بھی ہونا چاہیے، وہ نماز ہے جو مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے۔ اس نماز میں چاروں اَخلاق پائے جاتے ہیں۔ اس میں طہارت کا خُلق بھی ہے اور سماحت کا خُلق روزے کی سی حالت سے ہے کہ نماز میں کچھ کھانا پینا نہیں۔ عدل و انصاف کی بنیاد پر ڈسپلن بھی ہے کہ امام کی ایک آواز پر ''اللہ اکبر'' کہہ کر رکوع اور سجود میں جانا ہے، خواہ ذاتی تسبیحات مکمل ہوئی ہوں یا نہیں۔ آپ نے جسے امام مان لیا ہے، اس کی امامت کے تحت آپ کو نماز کے تمام ارکان مکمل کرنے ہیں۔ دیگر جتنے بھی شعائر ہیں، وہ ان چار بنیادی شعائر کے ذیل اور ضمن میں ہیں۔

ملّی سیاسی نظام کے بنیادی اساسی امور

شاہ صاحبؒ نے شروع مقدمے میں یہ بات واضح کی تھی کہ تمام شرائع اور قوانین کے نفاذ کے حوالے سے دو امور بنیادی

حیثیت رکھتے ہیں: ایک یہ کہ جو احکامات دیے گئے ہیں، ان کے پیچھے "حکمة البرّ و الإثم" یعنی نیکی اور بدی کی کیا حکمت کارفرما ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی شریعت اور قانون میں جن باتوں کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی ''سیاستِ ملیہ'' یعنی اس کا سیاسی نظام عملی طور پر کیسے قائم کیا جاتا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے علم اسرارِ دین کے حوالے سے پہلی پانچ مباحث میں بر و اِثم کی حقیقت اور اس کی حکمتِ نظری سے متعلق بنیادی اساسی اصول اور قواعد وضوابط بیان کیے ہیں۔ اس کے بعد ملت کی سیاسی تشکیل سے متعلق تمام مذاہب کے مسلمہ بنیادی قواعد واضح کیے ہیں۔

ملت کی تعریف اور حقیقت

اس مبحث میں چوں کہ ''سیاستِ ملیہ'' سے متعلق سیاسی امور پر بحث ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ملت کی تعریف اور اصل حقیقت سامنے آجائے۔ شاہ صاحبؒ نے "البدور البازغه" کے تیسرے مقالے "فی بیان المِلل و الشّرائع" کی پہلی فصل میں ملت کے معنی کی تحقیق اور اس کے وجود میں آنے کے اسباب پر بحث کی ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

"هل تستطيع أن تعلم أنّ الارتفاقات الّتی بُنی علیها نظام البشر، و أعطتها عناية الرّحمٰن بنوع الإنسان، و لا سيّما الارتفاق الثّانی و الثّالث، و الاقترابات الّتی أودعت فی طبائع البشر، و أبرزتها عناية الرّحمٰن بنوع الإنسان، و لا سيّما الإحسان و التّعبُّد و الاجتناب عن الشّرور، كُلّها امور كلّية تتأتّٰی بصورٍ كثيرةٍ .... فالصّورة المعيّنة و الوضع الخاص من تلك الصّور و الأوضاع من حيث يتأتّٰی به الارتفاقات و الاقترابات يُسمّٰی بالملّة." (69)

(کیا تم یہ جاننے کی استطاعت رکھتے ہو کہ: (۱) ارتفاقات: جو انسانیت کے نظام کی بنیاد ہیں اور اللہ رحمٰن کی عنایت نے انھیں نوعِ انسانیت کو عطا کیا ہے، خاص طور پر ارتفاقِ ثانی اور ارتفاقِ ثالث۔ (۲) اقترابات: جو انسانی طبیعتوں میں فطری طور پر ودیعت کیے گئے ہیں اور اللہ رحمٰن کی عنایت نے انھیں نوعِ انسانیت میں ظاہر کیا ہے، خاص طور پر اللہ کی عبادت اور صفتِ احسان کا خُلق اور شرور وفتن سے اجتناب کرنا۔ ان دونوں (ارتفاقات اور اقترابات) سے متعلق تمام امور قواعدِ کلیہ ہیں۔ جنھیں بہت سی عملی صورتوں اور شکلوں میں سرانجام دیا جاسکتا ہے۔...ان صورتوں اور طریقہ ہائے کار میں سے کسی خاص معین شکل وصورت اور خاص طریقۂ کار کے مطابق کوئی کام ایسے سرانجام دینا کہ اُس سے مطلوبہ ارتفاقات اور اقترابات حاصل ہوجائیں تو اُسے ''ملت'' کہا جاتا ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ ہر ایک ملت اپنے اختیار کردہ فکر و فلسفے کی بنیاد پر انسانیت کے مطلوب بنیادی ارتفاقات اور اقترابات کی ایک خاص شکل وصورت اور طریقۂ کار قائم کرتی ہے۔ اس حوالے سے شاہ صاحبؒ نے یہ بات بھی واضح کی ہے کہ میں نے ارتفاقات اور اقترابات بیان کرتے ہوئے ''ملتِ حنیفیہ'' کی بنیاد پر جو معین شکل وصورت بیان کی ہے، وہ بہ طور مثال کے ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ان ارتفاقات اور اقترابات کی یہی صورتیں لازمی اور ضروری ہیں۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"و لا تغترّ بما سقنا إليك من تصويرها و تمهيدها علٰی الملّة الحنيفية، فإنّها علٰی طريقة التّمثيل لا غير، فلا تظنن الواجب الأصلی محصوراً فيه، بل الحقّ أنّ الواجب الأصلی لا يكاد

یـذھـل عـنـہُ ملّة من الملل أصلاً و لا أن ینکرہُ أحد ممن یسمّٰی بشراً و إن عصاہ، و إنّما النّزا ع و الخلاف فی التصویر بصورة معیّنة و التّمھید علٰی وضع خاصّ.'' [70]

(تمھیں یہ بات دھوکے میں مبتلا نہ کرے کہ جو ہم نے ارتفاقات اور اقترابات کی عملی صورت اور اس کے انجام دینے کا طریقۂ کار ملتِ حنیفیہ کے مطابق بیان کیا ہے، اس لیے کہ یہ سب کچھ بہ طورِ مثال کے بیان ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اس سے تم یہ گمان نہ کر لینا کہ یہ ارتفاقات اور اقترابات کا لازمی وجود اسی مثال میں بند ہے، بلکہ حق بات یہ ہے کہ ملتوں میں سے کسی بھی ملت میں ان دونوں دائروں کے بنیادی اساسی امور کبھی نظرانداز نہیں ہوئے۔ اور ان بنیادی اساسی امور کا ان لوگوں میں سے کوئی انکار نہیں کرتا، جنھیں انسان کہا جاتا ہے، اگرچہ وہ خود اس کی خلاف ورزی ہی کیوں نہ کر رہا ہو۔ ملتوں کے درمیان اختلاف صرف اس پر ہوتا ہے کہ ارتفاقات اور اقترابات کی عملی معین صورت کیا ہوگی اور کسی ارتفاق اور اقتراب کو کس خاص طریقۂ کار کے مطابق بنایا جانا ضروری ہے۔)

انسانی زندگی میں ملتوں کی کیا اہمیت ہے؟ اور انسانیت کے لیے ملت کیوں لازمی اور ضروری ہے؟ پھر ملتیں کیسے وجود میں آتی ہیں؟ ان حقائق پر گفتگو کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ ''البدور البازغه'' میں لکھتے ہیں:

''و لـمّـا کـان أکثـر بـنـی آدم لا یـحـصلون علوم الارتفاقات و الاقترابات علٰی وجھھا، و لا یھتـدون لأصـولھا و تمھیدھا علٰی أوضاعھا، وجب من لُطف اللّٰہ تعالٰی و عنایته بنو ع الإنسان أن تـظھـر الـمِـلـل، و تـودع فـی جبـلّتھـم داعیة الانقیاد لملةٍ مّا مِن الملل، ثم تثار ارتفاقات توجب الانقیاد لملّة خاصّة. أمّا ظھور المِلل فیکون علٰی ضروب شتّٰی:

(الف) منھا: أن یتّصف بإقامتھا عالم معلّم من اللّٰہ، قد أحاط بعلوم الارتفاقات و الاقترابات، فمھّد الملّة تمھیداً مستویاً جامعاً، و ھٰذا الضّرب أعلٰھا و أسناھا.

(ب) و منھا:

(۱) أن یـظھـر مـلـک عادل فیبسط العدل، و ینشرہُ حسب ما عقل من المصلحة من معاملته مـع الـجـنـود و الـرّعیة، و من تنفیذہٖ للحدود و المزاجر، و من فصلہٖ للخصومات، و قطعہٖ بمادة الـنّـزا ع بیـنـھـم، و تـعیینہٖ للجیش لیوم الحرب، إلٰی غیر ذٰلک من أفاعیله سنّة مستحسنة معقولة مطبوعة، فیجیء المُلوک من بعدہٖ فیتّبعونہُ فیھا.

(۲) و یـظھـر مـن کـلّ قوم حکمائھم و مبرزوھم فیحصل من مجاریٰ عاداتھم و رُسومھم فی آثـارھـم فی نکاحھم و ضیافاتھم إلٰی غیر ذٰلک سنّة معقولة مستحسنة، فیجیء النّاس من بعدھم یتّبعونھم فیھا.

(۳) و ھٰکذا یظھر فی کلّ أھل صناعة إمام یقتدی بفعالہٖ.

(٤) و یـظھـر راشـد عـقـل وجھاً مـن وجـوہ الاقتـرابـات، فیکمّل به فیحصل من جریانہٖ فی مقتضیات قربہٖ سنّة مطبوعة یتّبعھا ناس من قومہٖ.

www.rahimia.org

و بالجملة فتحصل من علوم هٰذه الأئمّة جميعاً ملّةً لازمةً لا تعصٰى. و هٰذا الضّرب لم يخل عنهُ زمان و لا بلد قطّ.'' (71)

(انسانیت کی اکثریت ارتفاقات اور اقترابات کے بنیادی علوم پورے طور پر حاصل نہیں کرسکتی اور عام طور پر لوگوں کو ان علوم کے اصولوں اور ان کے عملی طریقۂ کار سے واقفیت نہیں ہوسکتی تھی، اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانیت پر اپنی مہربانی اور عنایت کے سبب لوگوں کے لیے ملتوں کو ظاہر کیا۔ نیز لوگوں کی جبلت میں کسی نہ کسی ملت کی اتباع اور فرماں برداری کا جذبہ پیدا کیا۔ پھر اس خاص ملت کے قائم کردہ ارتفاقات پر عمل درآمد کے لیے لوگوں کو اُبھارا۔

جہاں تک ملتوں کے وجود اور ان کے ظاہر ہونے کا معاملہ ہے تو اس کی چند اقسام ہیں:

(الف) ان میں سے ایک یہ ہے کہ اس ملت کو قائم کرنے والا ایک ایسا عالم (نبی اور رسول) ہوتا ہے، جسے اللہ کی جانب سے تعلیم دی گئی ہے۔ وہ تمام ارتفاقات و اقترابات کے علوم کا احاطہ کرتا ہے اور اس کے مطابق انتہائی متوازن اور جامع بہترین ملت تشکیل دیتا ہے۔ ملتوں کے قیام کی یہ قسم سب سے اعلیٰ اور سب سے بہترین ہے۔

(ب) ملتوں کے ظہور کے درجِ ذیل اسباب بھی ہوتے ہیں:

(۱) ایسے عادل حکمران کا وجود، جو انسانی مصلحتوں کو عقلی طور پر سمجھ کر عدل و انصاف پھیلاتا ہے۔ چناں چہ وہ عدل اور انسانی مصلحتوں کے پیشِ نظر درج ذیل تمام معاملات سے متعلق امور جاری کرتا ہے:

(i) عوام اور اپنے ماتحت لشکروں اور انتظامیہ سے متعلق معاملات۔

(ii) عدل ہی کے اصول پر سزاؤں اور تعزیرات کا نفاذ۔

(iii) عدل کے اصول پر جھگڑے نمٹاتا اور جھگڑوں کا سبب بننے والے معاملات کی روک تھام۔

(iv) اسی اصول پر جنگی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے فوجی لشکروں کی تیاری۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسے عادل حکمران کے یہ تمام اعمال و افعال لوگوں میں طبعی اور عقلی طور پر اچھے سمجھے جاتے ہیں اور بہتر طریقۂ کار اور نظام کے طور پر رائج ہوجاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد آنے والے حکمران ان تمام کاموں کو سرانجام دینے میں اُس عادل حکمران کی اتباع کرتے ہیں۔

(۲) کسی قوم میں ایسے حکما اور منتخبِ روزگار شخصیات پیدا ہوجاتی ہیں کہ جو اُن کے نکاح اور کھانے پینے اور مہمان نوازی وغیرہ سے متعلق امور میں ایسی عادات و رسومات جاری کرتے ہیں، جو انتہائی معقول اور پسندیدہ طریقۂ کار کے طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ ان کے بعد آنے والے لوگ ان طریقہ ہائے کار کی اتباع کرتے ہیں۔

(۳) ایسے ہی اہلِ صنعت و حرفت میں ایسے رہنما اور امام پیدا ہوتے ہیں، جن کے کاموں کی اتباع کی جاتی ہے۔

(۴) ایسے ہی کسی قوم میں ایسا ہدایت یافتہ عقل مند فرد پیدا ہوتا ہے، جو اقترابات کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو دریافت کرلیتا ہے۔ قربِ خداندی کے اس پہلو سے ہی اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ پھر اس کے

www.rahimia.org

تقاضوں کے مطابق عمل درآمد کرنا اس کے لیے ایک طبعی طریقۂ کار اور سنت بن جاتا ہے۔ پھر اُس کی قوم کے باقی لوگ قربِ الٰہی کے حصول کے اس طریقۂ کار میں اس کی اتباع کرنے لگتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ کسی قوم کے ان تمام شعبوں کے رہنماؤں کے دریافت کردہ اصولوں سے ایک ایسی ملت وجود میں آتی ہے، جس کے مطابق عمل کرنا لوگ لازمی سمجھتے ہیں۔ ملت کی تشکیل کی یہ قسم ایسی ہے، جس سے کوئی زمانہ خالی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی شہر اور علاقہ اس کے بغیر ہوتا ہے۔)

اس تناظر میں شاہ صاحبؒ نے سیاست کے بنیادی امور کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ ہر قوم کا سیاسی سسٹم بنانے کے لیے کچھ رہنماؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ رہنما ''ذو رأی راشد'' (درست رائے رکھنے والے) ہوں۔ یعنی ملکیتِ عالیہ اور بہیمیتِ شدیدہ کی اساس پر انسانی سوسائٹی کے عملی نظام بنانے کی اہلیت رکھنے والے ہوں۔ اسی طرح وہ ''رأی کلی'' یعنی اجتماعی تقاضوں کو سامنے رکھ کر سسٹم بنانے والے ہوں تو ان کا بنایا ہوا سسٹم اچھا بنتا ہے۔ اگر ''ذو رأی فاسد'' (ناقص رائے رکھنے والے) ہوں، یعنی انفرادی اور طبقاتی مفادات کے مطابق وہ عملی سیاسی نظام بنائیں تو اس سے نظام خراب ہوتا ہے۔ وہ بہ ظاہر نیکی اور بدی کا نعرہ ضرور لگائیں، لیکن عملی نظام فساد برپا کرنے والا ہو تو اس کے بُرے نتائج ظاہر ہوں گے۔ اس لیے رہنماؤں کا انتخاب ہر سیاست کے لیے ضروری ہے کہ جو آپ نے حکومت کے لیے رہنما بنائے ہیں یا جن کو لیڈر بنایا ہے، اس کا معیار کیا ہے؟ اس لیے انسان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والے رہنماؤں کا انتخاب کرنا ضروری ہے۔ ان رہنماؤں میں اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کا ہے۔ ان میں بھی امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ بلند ترین ہے۔

دوسری بات شاہ صاحبؒ نے کہی کہ جب رہنماؤں کا انتخاب ضروری ٹھہرا تو رہنما وہ ہونے چاہئیں، جو ''مفہّم'' یعنی سمجھ دار اور عقل مند ہوں۔ شاہ صاحبؒ نے ایسے ''مُفہّمین'' یعنی سمجھ دار لوگوں کی درجِ ذیل آٹھ اقسام بیان کی ہیں۔ چناں چہ:

1۔ وہ سمجھ دار آدمی جس کی زیادہ تر حالت ایسی ہو کہ اس پر حق تبارک و تعالیٰ کی جانب سے انسانی نفوس کو عبادات سے مہذب بنانے کے علوم آتے ہوں اور وہ انسانی نفوس کا تزکیہ کرتا ہو، وہ ''**کامل**'' ہے۔

2۔ جس آدمی کی اکثر حالت یہ ہو کہ وہ اُس سے اعلیٰ اَخلاق اور ارتفاقِ ثانی سے متعلق گھریلو امور اور علوم کی سمجھ حاصل ہو، اس حوالے سے وہ لوگوں کی رہنمائی کرے، وہ ''**حکیم**'' ہے۔

3۔ جس سمجھ دار آدمی کی زیادہ تر زندگی تمام سیاسی امور کو سرانجام دینے سے متعلق ہو اور اُسے لوگوں میں عدل و انصاف قائم کرنے اور لوگوں سے ظلم دور کرنے کی توفیق مل جائے تو اُسے ''**خلیفہ**'' کہا جاتا ہے۔

4۔ جس انسان پر ملاءِ اعلیٰ کے فرشتے اُترتے ہوں اور وہ اُس کو تعلیم دیں، اس سے مخاطب ہوں اور اسے نظر آئیں۔ اس طرح اس سے کرامات وغیرہ ظاہر ہوں، تو اسے ''**مؤیَّد بروح القدس**'' (جبرائیلؑ کا تائید یافتہ) کہا جاتا ہے۔

5۔ جس آدمی کی زبان اور دل میں نور ہو، لوگ اُس کی صحبت اور وعظ سے نفع اٹھاتے ہوں، اس سے وابستہ لوگوں میں اطمینان و سکون اور نور منتقل ہوتا ہو، اس کے متبعین اس کے واسطے سے کمال کے اعلیٰ درجات پر پہنچ جائیں اور وہ آدمی اُن کو ہدایت پر لانے کا سبب اور ذریعہ بنا ہو، اسے ''**ھادی**'' اور ''**مُزکّی**'' (تزکیہ کرنے والا) کہتے ہیں۔

6۔ جس فرد کے علم کا زیادہ تر حصہ کسی ملت کے قواعد و ضوابط کی معرفت حاصل کرنے اور ان کی مصلحتوں کو سمجھنے میں گزرے اور علم کا جو حصہ بھلایا جا چکا ہو، اس کو پھیلانے میں اس کا وقت خرچ ہو تو اُسے ''امام'' کہا جاتا ہے۔

7۔ جس سمجھ دار انسان کے دل میں دنیا میں کوئی عذاب آنے کی خبر ڈال دی گئی ہو یا کسی قوم پر اللہ کی لعنت کا فیصلہ ہو چکا ہو اور وہ اس سے لوگوں کو باخبر کرے یا آخرت میں قبر اور حشر میں انسانوں کے ساتھ جو کچھ ہونا ہے، اس کی اطلاع دے، اسے ''مُنذِر'' (عذابِ الٰہی سے ڈرانے والا) کہا جاتا ہے۔

8۔ جب اللہ کی حکمت تقاضا کرے کہ مخلوق کی طرف ان سمجھ دار لوگوں میں سے کسی ایک کو بھیجا جائے، جس کے ذریعے سے لوگ ظلمتوں کے اندھیروں سے نکل کر روشنی کی طرف آئیں اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کچھ ایسے فرائض لازمی قرار دے کہ جس کو لوگ اپنے ظاہر و باطن سے قبول کریں، پھر ملاءِ اعلیٰ کی جانب سے جو اُن کی اتباع کرنے والے لوگ ہیں، ان پر رضامندی ظاہر ہو اور جو اس کی مخالفت کرنے والے ہوں، ان پر لعنت برسے اور وہ یہ بات لوگوں کو بتلائے اور اپنی اطاعت کو لازمی قرار دے، وہ ''نبی'' ہوتا ہے۔

شریعت کا تصور اور امام الانبیا ﷺ کی جامعیت

رہنمائی کی جامع ترین شکل انبیاء کرام کی ہوتی ہے۔ گزشتہ انبیاء علیہم السلام میں ان آٹھ امور میں سے کسی کے اندر دو تھے، کسی کے اندر تین تھے، کسی میں چار تھے۔ یہ تمام امور اپنی مکمل ترین شکل میں جس شخصیت میں ہیں، وہ امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور پھر یہ بات بھی واضح کی ہے کہ ہر دور کی ایک شریعت ہوتی ہے اور تمام شریعتوں کے اصولِ دین ایک ہی ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم ﷺ تک تمام انبیاؑ کے اصولِ دین ایک ہی ہیں۔ دلیل کے طور پر قرآن کی یہ آیت لائے ہیں:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ [72] (راہ ڈال دی تمھارے لیے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم بھیجا ہم نے تیری طرف، اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو، اور موسیٰ کو، اور عیسیٰ کو، یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔)

شاہ صاحبؒ نے بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طریقے سے اصولِ دین ایک ہیں۔ اور پھر ہر دور کے تقاضوں کے مطابق انبیاؑ کی شریعتیں کیوں مختلف رہی ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے ذیل کی آیت سے استدلال کرتے ہوئے وضاحت کی ہے:

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا [73] (ہر ایک کو تم میں سے دیا ہم نے دستور اور راہ۔)

ہر نبی کی شریعت کی عملی شکلیں، قوانین اور عمل درآمد کے طریقۂ کار مختلف رہے ہیں۔ چناں چہ اس حوالے سے موسوی شریعت میں الگ تھا۔ عیسوی شریعت میں الگ تھا۔ اسی طرح دوسرے انبیا علیہم السلام کی شریعتوں میں الگ رہا ہے۔ اور اب نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں آ کر اس کی نئی اور مکمل شکل سامنے آئی ہے جو شریعتِ محمدیہ ہے۔ پھر اس کو بھی بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جتنے بھی انبیا حضورؐ سے پہلے آئے تھے، یہ قومی نبی تھے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ پانچ چیزیں مجھے

www.rahimia.org

خصوصیت کے ساتھ عنایت کی گئی ہیں، جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں ملیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے:

''و کان النّبیّ یبعث إلٰی قومهٖ خاصّة و بعثت إلٰی النّاس کافّة.'' (74) (مجھ سے پہلے نبی اپنی قوم کی طرف ہی خاص طور پر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور مجھے تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا گیا ہے۔)

شاہ صاحبؒ نے کہا کہ ایک مخصوص قوم کی عادات و اطوار کے مطابق جو شریعت ہوتی ہے، وہ ایک محدود دائرے کی ہوتی ہے۔ پھر اس کو یہودیت اور عیسائیت کی مثالوں سے ثابت کیا۔ لیکن جب کل انسانیت کے لیے نظام بنے گا تو کسی ایک جگہ کا تہذیب و کلچر یا کسی ایک قوم کی خصوصیات باقی اقوامِ عالم پر مسلط نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے نبی اکرمؐ نے ایک بین الاقوامی شریعت کی ضرورت کے مطابق بین الاقوامی قوانین اور ضابطے بتلائے۔ پھر شاہ صاحبؒ نے یہ بات بھی واضح کی کہ سیاست کے اندر لازمی اور ضروری ہے کہ جن امور کے بجا لانے کا حکم دیا گیا ہے، اس کی مقدار، اس کے اعداد اور اس کے اوقات متعین کیے جائیں، کیوں کہ عام آدمی کسی حکم پر تبھی عمل کرسکتا ہے جب اُس پر ایک سسٹم کے تحت دوٹوک عملی طریقہ واضح کیا جائے، مثلاً نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے تو نماز کتنے اوقات میں پڑھنی ہے؟ ہر وقت کی نماز میں کتنی رکعتیں ہیں اور وہ رکعتیں کیسے ادا کرنی ہیں؟ قیام کیا ہوگا؟ رکوع کیا ہوگا؟ یعنی اس کا تمام طریق کار واضح کردیا جائے۔ یہ اخبات الی اللہ کا عملی ڈھانچہ ہے۔ اسی طرح طہارت کا حکم دیا گیا تو طہارت ایک مبہم لفظ ہے اور اس مبہم لفظ کی واضح تشریح کی گئی کہ طہارت سے مراد کیا ہے۔ کس طرح کا حدث لاحق ہوجائے تو کس طرح کی طہارت کرنی ہے اور اس طہارت کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ کون سے اعضا کہاں کہاں تک، کیسے اور کتنی مرتبہ دھونے ہیں؟ اور بڑا حدث لاحق ہوجائے تو غسل کیسے کرنا ہے؟ اس کے فرائض اور واجبات کیا ہیں؟ یہ سب ملّی سیاست کے عملی امور ہیں، جنھیں وقت کا نبی آکر شریعت کے طور پر متعین کرتا ہے۔

پھر یہ بات بھی شاہ صاحبؒ نے واضح کی کہ سیاست میں یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ نتائج حاصل کرنے کے لیے کچھ بنیادی پالیسی اُمور ہوتے ہیں، جن کو ارکان اور فرائض کہا جاتا ہے۔ کسی حال میں جن پر کوئی سمجھوتہ (compromise) نہیں ہوگا۔ وہ ہر ایک کو کرنے ہیں اور کچھ ان کے مدد و معاون کے طور پر ذیلی اور ضمنی مستحبات یا مسنون عمل ہوتے ہیں کہ اگر کرلیا جائے تو اچھا ہے اور اگر نہ کیا جائے تو کوئی بڑا نقصان نہیں۔ تو ہر قانون میں یہ لچک موجود ہوتی ہے کہ اُس میں کمی و زیادتی پیش نظر رکھی جائے۔

بہرحال سیاست سے متعلق اُمور اور اُن کی مثالیں دے کر ثابت کیا کہ جو چیز نیکی اور بدی ہے، اس کو عمل میں لانے کے پروسیجر (procedure) اور سسٹم (system) بنانا، قاعدے بنانا اور ایک طریقۂ کار طے کرنا، یہ سیاست کے بنیادی امور ہیں۔ اس بات کو بھی واضح کیا ہے کہ اگر کوئی حکم متعین کیا جائے تو اس کی علت (reason) کیسے اخذ کرنی ہے۔ ''**باب الحُکم و العِلّة**'' میں شاہ صاحبؒ نے اس پر بحث کی ہے۔ پھر انسانی سوسائٹی میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے قانون ہوتا ہے تو قانون کی آسانیاں کیا ہیں۔ بروقت اگر کوئی کام نہ ہوسکے تو اس کی قضا اور رُخصت کا کیا طریقہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مختصراً یہ کہ سسٹم سے متعلق ایسے اُمور ہیں، جو دنیا بھر کے مذاہب اور قانون سازوں کے ہاں متفق علیہ ہیں، شاہ صاحبؒ نے انھیں واضح طور پر متعین کردیا ہے۔

''حکمة البّر و الإثم'' کی روشنی میں ملّی سیاست کی نبویؐ حکمتِ عملی

قوانین وشرائع کی پہلی بحث یعنی ''حکمة البِرّ و الإثم'' اور دوسری بحث یعنی ''سیاسةِ مِلّیه'' سے متعلق امور کے بنیادی قواعد وضوابط بیان کرنے کے بعد امام الانبیا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں ابحاث کے مسلمہ قواعد وضوابط اور اصولوں کی روشنی میں دینِ اسلام کا نظام کیسے ترتیب دیا؟ اس کی حقیقت واضح کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ نے ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' میں ساتواں ''مبحث استنباط الشرائع من حديث النّبيّ ﷺ'' قائم کیا ہے۔ اس مبحث میں نبی اکرمؐ کی احادیث کی روشنی میں ان اصولِ مذکورہ یا قواعدِ مذکورہ سے متعلق دین اسلام کا عملی نظام سامنے آجاتا ہے۔

اس میں سب سے پہلے شاہ صاحبؒ نے نبی اکرمؐ کے علوم کی بنیادی اقسام بیان کی ہیں۔ اس سلسلے میں بڑی بنیادی بحث یہ کی ہے کہ حضوؐر نے اُمتِ محمدیہ کو دو طرح کے بنیادی علوم سے روشناس کیا ہے۔ ان دونوں علوم کے فرق و امتیاز کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''إعلم! أنّ الشّارع أفادنا نوعين من العلم متمايزين بأحكامهما، متباينين فی منازلهما: فأحد النّوعين علم المصالح و المفاسد ... و النّوع الثانی علم الشّرائع و الحدود و الفرائض...'' (75)

(جاننا چاہیے کہ شارع (نبی اکرمؐ) نے ہمیں علم کی ایسی دو قسمیں بتلائی ہیں، جو اپنے احکامات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ممتاز اور اپنے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں: (۱) پہلی قسم انسانیت کے مصالح اور مفاسد سے متعلق علم ہے۔ ...(۲) دوسری قسم شرائع، حدود اور فرائض سے متعلق علم پر مبنی ہے۔...)

1۔ علم المصالح والمفاسد کی حقیقت

شاہ صاحبؒ نے نبی اکرمؐ کے علوم میں اس علم کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس سے میری مراد یہ ہے کہ:

(۱) دنیا یا آخرت میں نفع دینے والے اَخلاق حاصل کر کے اپنے نفس کو مہذب بنانا اور ان اَخلاق کی جو ضد ہیں، ان سے بچنا ہے۔ (۲) گھریلو زندگی کا نظم ونسق، معاشی نظام کے آداب وقواعد، ملکی اور قومی سیاست کے امور وغیرہ۔ ایسے امور ہیں کہ جن کے لیے کوئی خاص معین مقدار حضوؐر نے مقرر نہیں فرمائی۔ ان میں سے کسی مبہم کام کو کسی واضح اور مضبوط حدود اور دائرۂ کار کے ضابطے کی صورت میں بیان کیا ہے اور نہ ہی اس شعبے کے مشکل امور کو معلوم علامات کے ذریعے سے ممتاز کیا۔ بلکہ یہ وہ تمام امور ہیں، جن میں اچھی باتوں کی رغبت دلائی گئی اور بُری باتوں کو دور کرنے کا حکم دیا گیا۔ ہر دور کے عرف کے مطابق اہلِ زبان اپنی مصلحتوں کے پیشِ نظر ان امور کو سرانجام دینے کا نظام بنا سکتے ہیں۔ اور جن چیزوں سے روکا گیا ہے، ان سے روکنے کا نظام بنا سکتے ہیں۔ اس علم کے ذیل میں شاہ صاحبؒ نے مصلحت اور مفسدہ کی حقیقت بیان کی ہے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

''كُلّ مصلحة حثّنا الشّرع عليها و كلّ مفسدة ردعنا عنها، فإنّ ذٰلک لا يخلو من الرّجوع إلٰی أحد اصول ثلاثة:

أحدها: تهذيب النّفس بالخصال الأربع النّافعة فی المعاد، أو سائر الخصائل النّافعة فی الدّنيا.

و ثانيها: إعلاء كلمة الحقّ، و تمكين الشّرائع، و السّعي في إشاعتها.
و ثالثها: انتظام أمر النّاس و إصلاح ارتفاقاتهم و تهذيب رسومهم.[76]

(ہر وہ مصلحت جس پر شریعت نے ہمیں ابھارا ہے اور ہر وہ مفسدہ جس سے ہمیں ڈرایا ہے، وہ درجِ ذیل تین اصولوں میں سے کسی ایک اصول کے دائرے سے باہر نہیں ہے:

(۱) ان میں سے ایک یہ کہ اَخلاقِ اربعہ کے ذریعے سے اپنے نفس کو مہذب بنانا کہ جن سے آخرت میں فائدہ ہوتا ہے، یا دیگر ایسی اچھی عادات کو اپنانا کہ جو دنیا میں نفع پہنچاتی ہیں۔

(۲) اللہ کے کلمے کو غالب کرنے اور شریعت کے نظام کو قائم کرنے اور اس کی اشاعت اور پھیلاؤ کے لیے جدوجہد اور کوشش کرنا۔

(۳) لوگوں کو درپیش امور کا بہترین نظم و نسق قائم کرنا، ان کے ارتفاقات کو درست کرنا اور ان کی رسومات کو مہذب بنانا۔)

2۔ علم الشرائع والحدود والفرائض کی حقیقت

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اس علم سے میری مراد وہ امور ہیں کہ شریعت نے جن کی حدود اور مقدار وغیرہ متعین کردی ہے۔ اور جتنے مصالح اور مفاسد ہیں، ان کو واضح علل و اسباب اور مضبوط علامات کے ذریعے سے متعین کردیا ہے۔ ان مقررہ حدود و مقدار کے مطابق جہاں جہاں علت پائی جاتی ہے، وہاں وہاں شرعی حکم بھی پایا جاتا ہے اور لوگوں کو انھی کا پابند بنا دیا گیا ہے۔ اس قسم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

’’و مرجع هٰذا النّوع إلٰى قوانين السّياسة الملّية و ليس كل مظنّة لمصلحة توجب عليهم و لكن ما كان منها مضبوطا امراً محسوساً أو وصفاً ظاهراً يعلمهٗ الخاصّة و العامّة.‘‘[77]

(علم کی یہ قسم ملّی سیاست کے قوانین کا مرکز اور منبع ہے۔ کسی مصلحت کو حاصل کرنے کے لیے جتنے ممکنہ طریقے ہیں، وہ سب انسانوں کے لیے لازمی نہیں ہیں۔ صرف وہ طریقۂ کار لازمی ہوگا کہ جس کے امور کسی ضابطے میں آجائیں اور وہ ایک امرِ محسوس کے طور پر سامنے آئیں، یا اُس کام کے ایسے ظاہری اوصاف ہوں کہ جنھیں ہر عام و خاص جانتا ہو۔)

نبی اکرمؐ سے شریعت کی تعلیم حاصل کرنے کا طریقۂ کار

اس مبحث میں شاہ صاحبؒ نے نبی اکرمؐ سے شریعت کی تعلیم حاصل کرنے کی کیفیت بھی واضح کی ہے۔ اس سے متعلق اصول وضوابط بیان کیے ہیں۔ اس سلسلے میں جو بنیادی بات شاہ صاحبؒ نے واضح کی ہے، وہ یہ کہ اس دور میں شرائع اور احکامات کی معلومات نبی اکرمؐ کی احادیث کے بغیر ممکن نہیں۔ نبی اکرمؐ سے تعلیم حاصل کرنے کے طریقۂ کار کے چند بنیادی اساسی امور شاہ صاحبؒ نے متعین کیے ہیں:

1۔ کتبِ احادیث کے طبقات کا علم
2۔ کسی کلام کا صحیح مفہوم سمجھنے کا علم
3۔ کتاب وسنت سے شرعی معانی سمجھنے کا علم
4۔ احادیث میں اختلاف کی صورت میں انھیں حل کرنے کا علم

www.rahimia.org

شاہ صاحبؒ نے اس مبحث کے چند ابواب میں ان چاروں علوم کے بنیادی امور واضح کیے ہیں۔

1۔ کتبِ احادیث کے طبقات کا علم

شاہ صاحبؒ نے احادیث کی جمع و ترتیب کے حوالے سے قرنِ اوّل میں مدوّن شدہ کتابوں کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ انھوں نے اس دور میں حدیث کی تمام کتابوں کی صحت اور شہرت کے حوالے سے چند طبقات متعین کیے ہیں۔ طبقۂ اولیٰ کی کتابوں میں ''**مؤطّا**''، ''**صحیح بخاری**'' اور ''**صحیح مسلم**'' کو شامل کیا ہے۔ اور طبقۂ ثانیہ کی کتابوں میں ''**سنن ابی داؤد**''، ''**جامع ترمذی**'' اور ''**مجتبیٰ النّسائی**'' کو شامل کیا ہے۔ ان کتابوں کو شاہ صاحبؒ نے صحاح ستہ سے تعبیر کیا ہے۔ تیسرے، چوتھے اور پانچویں طبقے میں دیگر مسانید و جوامع کو بیان کیا ہے۔

2۔ کسی کلام کا صحیح مفہوم سمجھنے کا علم

شاہ صاحبؒ نے کسی کلام کی اصل مراد سمجھنے کے دس طریقے اور اقسام بیان کی ہیں۔ منطوقِ کلام سے سمجھنے کے چار طریقے، مفہومِ کلام سے سمجھنے کے تین طریقے اور مضمونِ کلام سے سمجھنے کے تین طریقے متعین کیے ہیں۔ اس طرح فہمِ کلام کو سمجھنے کا ایک جامع نظام شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے۔ شاہ صاحبؒ اس علم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ''**الفوز الکبیر**'' میں لکھتے ہیں:

> ''و ایں فقیر را حصر استنباطات در دہ قسم، و ترتیب آں اقسام بہ خاطر ریختہ اند، و آں مقالہ میزانے است عظیم برائے سنجیدن بسیارے از احکامِ مستنبطہ۔''(78)
>
> (اس فقیر کے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ (کسی کلام سے) اخذ و استنباط کے طریقے دس قسموں میں منحصر ہیں اور ان میں ترتیب کا لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ بہت سے مستنبط شدہ احکامات کو پرکھنے کے لیے یہ مقالہ بہت عظیم معیار اور میزان ہے۔)

3۔ کتاب و سنت سے شرعی معانی سمجھنے کا علم

شاہ صاحبؒ نے اس علم میں کتاب و سنت میں استعمال کیے جانے والے صیغوں کے مطالب اور مفاہیم سمجھنے کے اصول بیان کیے ہیں۔ اسی طرح کسی حکم کی علت، رُکن اور شرط معلوم کرنے کا طریقۂ کار واضح کیا ہے۔

4۔ احادیث میں اختلاف کی صورت میں انھیں حل کرنے کا علم

احادیث و روایات میں تعارُض اور اختلاف ہونے کی صورت میں محدثین اور فقہا نے انھیں حل کرنے کے طریقے بیان کیے ہیں۔ ان کا ایک مکمل نظام بھی شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے۔ اس حوالے سے چار بنیادی امور طے کیے ہیں:

1۔ تاویل 2۔ تطبیق 3۔ نسخ 4۔ ترجیح

شاہ صاحبؒ اس مبحث کے آخر میں ایک ''**تتمّہ**'' لائے ہیں، جس میں آپؒ نے صحابہؓ اور تابعینؒ کے فروعی مسائل میں اختلافات کے حل کرنے کے اصول اور فقہا اور مجتہدین کے فقہی اختلافات کو حل کرنے کے اصول و ضوابط پر بڑی عمدہ بحث کی ہے۔ پھر دین اسلام کے غلبے کے چار سو سال بعد کے حالات کا تحلیل و تجزیہ کیا ہے اور اس طرح ''**القسم الاوّل**'' میں متعین

www.rahimia.org

کیے گئے سات مباحث کے بنیادی قواعد وضوابط کا ایک مکمل اور مربوط فلسفہ سامنے آتا ہے۔ نبی اکرمؐ نے جو تشریعی نظام دیا، وہ دراصل ملتِ ابراہیمیہ حنیفیہ کے طے شدہ قواعد وضوابط کی تشریح تھی۔ اسی کو ''فلسفة التّشريع الإسلامی'' (Philosophy of Islamic Legislation) کہا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت دراصل انھی مسلمہ اصولوں، قواعد اور قوانین کی عملی شکلیں واضح کرتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کی دو حیثیتیں

شاہ صاحبؒ نے ایک اَور بحث ''التّفهيمات الإلٰهيه'' میں اور دیگر کتابوں میں کی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت کی بھی دو بنیادی حیثیتیں ہیں: ایک حیثیت سعادتِ قریش، یعنی قومی انقلاب برپا کرکے قریش کی ترقی اور کامیابی کا نظام بنایا جس سے عربوں اور قریش کی ترقی ہوئی۔ آپؐ کی دوسری حیثیت نبوتِ عامہ ہے۔ وہ نبوتِ عامہ تمام انسانیت کی تمام اقوام کے لیے ہے۔ اس پس منظر میں فہم حدیث اور قرآن کے حوالے سے اس اہم اور بنیادی بات کی نشان دہی شاہ صاحبؒ نے کی ہے کہ پہلے یہ معلوم ہو کہ جو قرآن کی آیت ہم پڑھ رہے ہیں یا جو حدیث پڑھ رہے ہیں، اس کا تعلق سعادتِ قریش کے مخصوص دائرے سے ہے یا اس کا تعلق نبوتِ عامہ کے دائرے سے ہے؟ ہر بات جو حدیث میں آ گئی، اس کو عمومی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ کیوں کہ حدیث میں تو ایسی چیزیں بھی آتی ہیں کہ جو حضورؐ کی ذاتِ قدسیہ کے ساتھ خاص ہیں۔ اسی طرح حدیث میں تو ایسی چیزیں بھی ہیں جو صرف قریش کی ترقی اور کامیابی کے حوالے سے مخصوص ہوں۔ اب اس علم اسرارِ دین کی روشنی میں یہ تعین کرنا ضروری ہے کہ سعادتِ قریش سے متعلق اُمور کون کون سے ہیں، جو ایک قومی انقلاب کے لیے ضروری ہیں، اور وہ امور جو بلاتفریق رنگ، نسل، مذہب کل انسانیت کے لیے ہیں، جو فرمانِ نبویؐ ''بُعِثْتُ إلٰی النّاسِ عامّةً'' [79] (کل انسانیت کی طرف عمومی بعثت) کی حیثیت سے نبی اکرمؐ نے تمام اقوامِ عالم کے لیے بیان کیے ہیں، وہ کیا ہیں؟ ان کے مابین فرق کرنا بڑا ضروری ہے۔

حقیقتِ انسانی کے تناظر میں فلاحِ انسانیت کا بہترین نظام

علم اسرارِ دین کی روشنی میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے اور فکر کا ایک بنیادی خاکہ گزشتہ بحث سے ہمارے سامنے آچکا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسانیت کے لیے وہی نظام صحیح اور درست ہوگا، جو کائنات کے حقائق، انسانی نوع کی حقیقی حیثیت کے مطابق برّ و اِثم یعنی نیکی اور بدی کی حکمت کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے عملی سیاسی اور معاشی نظام قائم کرے۔ جس کے نتیجے میں اس حضرتِ انسان کی دونوں قوتوں کے درمیان اعتدال ہو اور اسے دنیا اور آخرت میں سعادت اور کامیابی حاصل ہو۔ صرف جسمانی خواہشات کو پورا کرنا یا محض روحانیت کے نام پر انتہا پسندی کا نظام قائم کرنا درست نہیں ہے۔

اس تناظر میں دیگر فلسفہ ہائے فکر کا جائزہ لیا جائے تو ''مشائین'' یا مادی نقطہ نظر سے انسان کے لیے عقلی نظام سوچنے والے لوگوں کا بنایا ہوا فلسفہ، خواہ وہ فلسفہ یونان ہو، یا آج اسی فلسفے کی اساس پر سرمایہ داری یا سوشلزم ہو، یہ انسان کا صرف ایک جسمانی اور مادی پہلو لیے ہوئے ہے۔ یہ فلسفہ ہائے حیات اس کرۂ ارض کی مادی غذائی ضروریات کی اساس پر انسانی جسم کے تقاضوں کی تکمیل کا سسٹم بنانے کے قوانین اور ضابطے بتلاتے ہیں، لیکن اس فلسفے میں انسان کی مَلَکیت کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے کوئی

قانون اور ضابطہ ان کے پیش نظر نہیں۔

اسی طریقے سے وہ لوگ جو رجعت پسند فرسودہ مذاہب، رہبانیت اور محض روحانیت کے نام پر جسمانی تقاضوں کو ''دنیا'' قرار دیتے ہیں۔ جسمانی تقاضوں سے برأت کا نظریہ رکھتے ہیں کہ ان کے ہاں ''دین'' صرف اس کا نام ہے کہ ہمیں بس صرف اور صرف آخرت کی فکر کرنی چاہیے، دنیا میں چاہے ذلت ہو، یہاں جوتے پڑ رہے ہوں، بھوکے ہوں یا ننگے، یہاں ذلیل اور رُسوا ہوں، انھیں اس کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے۔ یعنی رہبانیت کا وہ تصور، جس میں سیاست، معیشت، سماجیات و ارتفاقات زیر بحث نہ آئیں۔ یہ بھی انسان کا ناقص اور ادھورا مطالعہ ہے۔ چناں چہ مسخ شدہ یہودیت، مسخ شدہ عیسائیت، مسخ شدہ ہندومت، اور مسخ شدہ دیگر مذاہب کی صورتِ حال یہی ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ اصل تو انسانی روح ہے۔ وہ اس روح کو پاک اور پوتر بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جسم اس کی روح پر ایک پاپ ہے۔ یہ لوگ جسم کے تقاضوں اور خواہشات کو فنا کرنے کے لیے کسی غار اور کھوہ میں جا کر بیٹھ جاتے ہیں، کوئی راہب بننا چاہتا ہے، کوئی گیان دھیان کرنے والا گرو اور مہنت بن کر ریاضتیں اور مشقتیں برداشت کرنے میں مصروف ہے۔ وہ اپنے تمام جسمانی تقاضے منقطع کر کے صرف روح کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بھی بہت سے ایسے فرقے ہیں جو ارتفاقات کے سیاسی و معاشی تقاضوں کو نظر انداز کرتے ہوئے انسان کو روحانی انسان سمجھ کر اس کے ساتھ رہبانیت کا سا معاملہ کرتے ہیں اور اس کے لیے ضابطے اور قاعدے بتلاتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ انسان کی فلاح کے دونوں طریقے انتہا پسندانہ ہیں۔ محض عقلی مادیت کی بنیاد پر یا محض روحانیت کے نام پر انسان کے کسی ایک شعبے کو لے کر قانون بنانا یا نیکی اور بدی کا تعین کرنا انسانیت کی اصل حقیقت کے حوالے سے درست نہیں۔ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اس لیے کہ عقل، نقل اور کشف و وِجدان تقاضا کرتے ہیں کہ انسان ان دونوں قوتوں کے اعتدال سے ترقی کرے۔ چناں چہ شاہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:

'انسان چوں مرکب است از دو قوت؛ (۱) مَلَکیه (۲) و بهیمیه۔ اعتدالِ نوعِ اُو تقاضا مے کند، آں حرکات را کہ بہ سببِ آں ہر دو قوت بجائے خود بہ ماند۔ و در معاد سعادت نصیب اُو شود۔ و در ارتفاقاتِ ضروریہ؛ از آدابِ معیشت، و نکاح، و ابتغاءِ معیشت، و سیاستِ مدن از جادۂ قویمہ بیرون نہ رود۔ و ایں ہمہ احوال و افعال را برائے نوعِ انسان معین کردن تشریع است۔''(80)

(انسان جب دو قوتوں ملکیت اور بہیمیت سے مرکب ہے تو اس کی نوع میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے یہ تقاضا پیدا ہوتا ہے کہ ہر دو قوتوں سے سرزد ہونے والی حرکات اور اعمال اپنے اپنے دائرۂ کار کے مطابق رہیں۔ اسے آخرت میں کامیابی نصیب ہو اور دنیا میں ضروری ارتفاقات مثلاً زندگی بسر کرنے کے آداب اور طور طریقے، نکاح اور وسائلِ معاش کے حصول اور ملکوں اور قوموں کی سیاست اعتدال کے دائرے سے باہر نہ جائے۔ ان امور کے حوالے سے انسان کے تمام احوال و افعال کو متعین کرنا تشریعی اور قانونی حیثیت رکھتا ہے۔)

جب دونوں قوتوں کی کامیابی سے انسان کو سعادت حاصل ہونی ہے تو اس کی قوتِ مَلَکیه کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس میں ''اعلیٰ اَخلاق'' پیدا ہوں اور اس کے جسم کو مہذب بنانے اور اسے ڈسپلن میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ ''ارتفاقات'' کو

صالح بنیادوں پر قائم کیا جائے۔

ولی اللّٰہی فکر کی روشنی میں متوازن سوچ کی ضرورت

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بیان کردہ ''علمِ اسرارِ دین'' کو پوری جامعیت کے ساتھ سمجھا جائے تو اس سے ایک متوازن فکر پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح بات صحیح تناظر میں سمجھ میں آتی ہے۔ آج کل بعض لوگ شاہ صاحبؒ کا نام استعمال کرکے اُن کے فلسفے اور فکر کی کچھ جزوی باتوں کو بنیاد بنا لیتے ہیں اور اپنے خود ساختہ علمی اور عملی تصورات کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چناں چہ صرف انسانیتِ عامہ یا نبوتِ عامہ کے نام پر بعض لوگ آج کل بیرون ملک بیٹھ کر چینلوں کے ذریعے سے خود ساختہ خیالات پھیلا رہے ہیں۔ ''علمِ اسرارِ دین'' کا مکمل فلسفہ اور خاکہ سمجھے بغیر اس علم کی کوئی ایک آدھ بات لے کر اسے یہ کہنا کہ: ''یہ تو عربوں کی خصوصیات تھیں، اب اس زمانے کے لوگوں کے لیے یہ لازمی نہیں ہے۔'' حال آں کہ اس کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے علمِ اسرارِ دین پر مکمل فہم و بصیرت اور عبور حاصل ہو، اس کے تناظر میں آیات اور احادیث، فقہ اور اجماعِ صحابہؓ کو پورے طور پر سمجھا جائے۔ اِدھر اُدھر سے ساری باتیں کاٹ کر درمیان میں سے کوئی ایک بات شاہ صاحبؒ کی لے کر اپنے خام تصورات کے تحت گفتگو کرنا ہمارے ہاں بڑے ایسے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ جیسا کہ علی گڑھ کالج کے بانی نے شاہ صاحبؒ کی بات کو درست تناظر میں سمجھے بغیر اپنی کتاب ''تحریر فی اصولِ تفسیر'' میں اسی طرح کی تنقید کی ہے۔[81] حال آں کہ وہ بات شاہ صاحبؒ نے کہی ہی نہیں، بلکہ درمیان میں سے عبارت نکال کر اپنی طرف سے تصور قائم کرلیا گیا اور پھر شاہ صاحبؒ کے فلسفے پر اعتراض شروع کردیے گئے۔ اسی طریقے سے چند دوسرے لوگوں کا بھی یہی معاملہ ہے کہ پورا علمِ اسرارِ دین اور اس کا پورا ڈھانچہ، اس کی بصیرت حاصل کیے بغیر کچھ چیزیں اپنی من مرضی کی یا اُن کی سمجھ میں جتنی آئیں، اس کے مطابق لے لیتے ہیں۔

اسی طرح آج امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی آڑ میں کوئی صرف توحید اور شرک کے نام پر فرقہ واریت کے لڑائی جھگڑے پیدا کرتا ہے۔ کوئی شاہ صاحبؒ کے نام پر شیعہ سنی جھگڑے پیدا کرتا ہے۔ اپنے اپنے مذہب اور مکتبہ فکر کے اعتبار سے کوئی شاہ صاحبؒ کو اپنا مزعومہ ''صوفی'' بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ کوئی موحد بن کر مشرکوں کی گردن اڑانے کے لیے شاہ صاحبؒ کا نام استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کوئی اپنی مادیت پرستی کو ثابت کرنے کے لیے شاہ صاحبؒ پر مادہ پرست ہونے کی الزام تراشی کرتا ہے، لیکن اگر شاہ صاحب کا یہ مکمل علم اسرارِ دین اور اس ''فلسفةُ التّشريع الإسلامی'' کا پورا خاکہ سامنے ہو اور اس کی اساس پر فہم و بصیرت موجود ہو تو یقیناً انسانی سوسائٹی کی ترقی کے لیے فکر و فلسفہ، سیاسی نظام اور معاشی اور اقتصادی نظام قائم کرنے کے لیے بہت سے پہلو واضح ہو سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بیان کردہ اس ''علمِ اسرارِ دین'' کو جامعیت کے ساتھ سمجھنے اور اس کے مطابق اپنے فکر و عمل کے گوشوں کو روشن کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

سوالات و جوابات

سوال: حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے ایک بات فرمائی ہے کہ یہ چیز مجھ پر منکشف ہوئی۔ الفوز الکبیر میں بھی انھوں نے اس بات کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کی زبانِ فیض ترجمان سے بھی یہ الفاظ ادا ہوئے کہ یہ روایت بالمعنی ہی کہیں گے کہ ہزار سال تک کسی نے یہ کام نہیں کیا۔ شاہ صاحبؒ کا جو اونچا مقام ہے، اس کے اعتبار سے بہرحال تمام لوگوں کے لیے قبول ہے۔ مگر جب اسی بنیاد پر ہم یا کوئی اَور آدمی چھوٹے میدان میں ایسی کوئی ایک بات کہتا ہے یا کرتا ہے تو ہمارا اس پر اعتراض ہوتا ہے کہ چودہ سو سال تک کسی کو یہ بات سوجھی نہیں ہے۔ یہ اس کو ہی سمجھ آئی ہے۔ اس پس منظر میں مَیں جاننا چاہوں گا۔ آپ نے جو کچھ ارشاداتِ عالیہ سے مستفید فرمایا، پہلے جو ساری کی ساری اٹھان تھی، آخر میں آ کر دو چار لوگوں پر تنقید کر کے ختم ہوئی۔ ان لوگوں کو بھی آپ موقع ہی نہیں، بلکہ حق دیں کہ وہ اپنی رائے پیش کریں۔ رائے پر تنقید ہوسکتی ہے، لیکن ہم ایک نقطہ نظر پر ان کو اپنا پابند بنانا چاہتے ہیں تو یہ علم کی موت ہے۔ اس حوالے سے ذرا وضاحت فرما دیں۔

جواب: کل کی گفتگو میں مَیں نے یہ بات عرض کی تھی کہ علوم جتنے بھی ہیں، وہ بعد میں مرتب اور مدوّن ہوئے ہیں، مثلاً امام بخاریؒ نے احادیث حضور ﷺ کے دو ڈھائی سو سال بعد مرتب و مدوّن کی ہیں۔ اسی طریقے سے ڈیڑھ دو سو سال بعد احناف، مالکی اور شافعی حضرات نے فقہ مرتب کی۔ یہاں تک کہ عربی زبان کی گرائمر کے قاعدے ضابطے بھی بعد میں آئے ہیں۔ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں کے مطابق علوم کا دنیا میں نزول ہوا اور اس کے مرتب کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔

حضورؐ کے زمانے میں تو قرآن پاک بھی ایک جگہ پر جمع نہیں تھا۔ بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہٗ کے زمانے میں ضرورت پیش آئی تو اس کو کتابی شکل میں مرتب کر دیا گیا۔ اسی طرح بعد میں ضرورت پیش آئی تو احادیث مرتب ہوگئیں۔ اسی طرح علم اسرارِ دین کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شاہ صاحبؒ نے واضح کیا ہے کہ علوم الحدیث کے جمع و تدوین کا ایک زمانہ تھا۔ اس کے بعد اگلا زمانہ اس کی چھان پھٹک کا تھا، اُس کے مشکل جملوں کی تشریح کا تھا، مشکل الحدیث اور غریب الحدیث پر کام ہوا۔ پھر اس کے بعد فقہ الحدیث کا زمانہ آیا، جس میں فقہا نے احادیث کے فقہی، فروعی اور ان کے اصول و قوانین پر کام کیا۔

اب اس زمانے میں ضرورت پیش آئی کہ اس سے آگے بڑھ کر دنیا بھر کے دیگر فلسفوں اور مذاہب کے تناظر میں جو علوم عقل، نقل اور کشف کے ذریعے سے وجود میں آئے ہیں، ان تمام کو یک جا کر کے دین اسلام کو بہ طور ایک فلسفے اور نظام کے انسانیت کے سامنے رکھنا چاہیے، چناں چہ اس دور کی ضرورت کے تقاضوں کے تحت شاہ صاحب نے یہ علم اسرارِ دین مرتب اور مدوّن کیا۔

خود شاہ صاحبؒ نے اس سوال کا جواب دیا ہے کہ آخر مجھے کیوں یہ ضرورت پیش آئی؟ شاہ صاحبؒ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' کے مقدمے میں تفصیل سے اس بات کا جائزہ لیا ہے اور وضاحت کی ہے کہ اس علم کے اصول، قاعدوں، ضابطوں کے اشارات قرآن میں بھی موجود ہیں، احادیث میں بھی موجود ہیں۔ اسی طریقے سے صحابہؓ کے اقوال میں بھی موجود ہیں۔ تاریخ میں کچھ علما، ـــــ جن میں امام غزالیؒ، علامہ خطابیؒ وغیرہ شامل ہیں ـــــ نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ تمام اشارات اور اقوال بکھرے ہوئے تھے، اس لیے ان کو ایک علم و فن کی صورت میں ترتیب دے کر شاہ صاحبؒ نے لوگوں کے سامنے رکھا ہے۔

ایک مربوط فلسفے کے تحت علم اسرارِ دین تینوں دائروں سے تعلق رکھتا ہے، جس میں عقل کا استعمال بھی ہے، نقل کا استعمال بھی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ علم کا تیسرا اور اہم ترین ذریعہ کشف بھی ہے۔ یعنی یہ علم تینوں چیزوں کی اساس پر ہے۔ میں نے اس سے پہلے لیکچر میں ان تینوں دائروں پر بحث اور گفتگو کی تھی اور شاہ صاحبؒ کی خصوصیت یہی بیان کی تھی کہ خالی کشف یا انکشاف نہیں ہے کہ بیٹھے بیٹھے کوئی خیال آ گیا اور شاہ صاحبؒ نے اٹھ کر اس پر کام شروع کر دیا۔ بلکہ عقل، نقل اور کشف تینوں کی بنیاد پر حقائق کائنات کے کچھ واقعی امور اور ان کے قاعدے ضابطے مرتب کیے اور پھر اُس کی روشنی میں جو سسٹم بننا چاہیے تھا، اس سسٹم پر شاہ صاحبؒ نے گفتگو کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ رائے کے اختلاف کا حق تو ہر ایک کو حاصل ہے۔ ہم ہر ایک عالم کا انسانی حق سمجھتے ہیں کہ وہ اختلافِ رائے کرے۔ لیکن جو لوگ اپنے آپ کو شاہ صاحبؒ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں، اور اُن کی ایک بات لے لیں اور باقی باتیں چھوڑ دیں، تو یہ درست نہیں۔ اگر آپ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کو عصری حوالے سے معیار مانتے ہیں شاہ صاحبؒ کے نام پر اپنی بات اور گفتگو منواتے ہیں تو شاہ صاحبؒ کی پوری بات لینی چاہیے، جیسا کہ کسی نے ہمارا مؤقف لینا ہے تو ہماری پوری بات سنیں گے تو پتہ چلے گا۔ یہ نہ ہو کہ شاہ صاحبؒ کا نام لیں اور اُن کی ادھوری بات لے لیں اور اگر آپ شاہ صاحبؒ کو چھوڑ کر کوئی نیا فکر بنانا چاہتے ہیں تو ضرور بنائیں۔ آپ کا یہ انسانی حق ہے کہ آپ رائے قائم کریں، لیکن دلائل کی بنیاد پر۔ ظاہر ہے کہ جواب میں ہم بھی اپنے دلائل قائم کریں گے۔ پھر بات چیت اور گفتگو ہوگی۔ یہاں تو بات چیت اس بنیاد پر ہو رہی ہے کہ شاہ صاحبؒ کو ہم مسلمہ شخصیت مان رہے ہیں لہٰذا ان کے حوالے سے ادھوری بات نہیں ہونی چاہیے۔ ادھوری بات لے کر اُس پر تنقید کرے، تو وہ رویہ درست نہیں۔ جامع طور پر شاہ صاحبؒ کے مکمل فکر و فلسفے کو سامنے رکھ کر گفتگو کی جائے تو ٹھیک ہے، خوش آمدید۔

سوال: آپ نے عالم مثال کے حوالے سے شاہ صاحبؒ کی بات کی۔ یونانی فلاسفہ کے ہاں بھی اس حوالے سے انسانیت کا ایک فلسفہ موجود ہے۔ شاہ صاحبؒ کے عالم مثال کے تصور کا اس سے کیا فرق ہے؟

جواب: بات یہ ہے کہ علوم لوگوں پر آتے ہیں۔ کسی پر عقل کے راستے سے آئے، کسی پر کشف کے راستے سے آئے اور کسی پر انبیا علیہم السلام کی تعلیمات کے واسطے سے آئے۔ ہم جب کسی کو غلط قرار دیتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ یہ مکمل طور پر ہی غلط ہے۔ حال آں کہ دنیا میں جتنے حکما، فلاسفر یا سائنس دان یا رہنمایانِ قوم ہوئے ہیں، وہ سو فی صد غلط ہوں تو رہنما نہیں بنتے۔ اُن کے پاس علم کا ایک ذریعہ ضرور ہوتا ہے۔ علم کی کچھ بنیادیں ہوتی ہیں۔ غلط فہمی یا کسی دوسرے تناظر میں سمجھنے کی کوئی کمی ضرور ہو سکتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے توجہ دلائی ہے کہ گزشتہ جتنے بھی حکما گزرے ہیں، وہ دراصل اپنے اپنے دور کے انسانوں کے رہنما ہیں۔ ہوا یہ کہ انبیاءؑ کی اصلی تعلیمات میں تحریفات ہوئی ہیں، اور ان کی تاویلات میں اختلاف ہو گیا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات یہودیوں نے تبدیل کر دیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں اُن کے ماننے والوں نے تبدیلیاں کر دیں اور وحدانیت کے بجائے ''تثلیث'' کا نعرہ لگا دیا۔

قرآن یہ کہتا ہے کہ ''وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ''(82) اسی طرح ارشاد خداوندی ہے: ''وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيرٌ''(83) کہ دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جس میں ہم نے کوئی ڈرانے والا اور نبی نہ بھیجا ہو۔ ممکن ہے کہ افلاطون اپنے دور کا حکیم اور نبی ہو اور

اُس نے بھی اُسی منبع سے فکر لی ہو، جس منبع سے انبیا علیہم السلام لے رہے ہیں لیکن مرورِ زمانہ یا تحریف در تحریف سے اس کی تعبیرات کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آتے رہے ہوں۔ اب اگر قرآن و حدیث عالم مثال کی تصدیق کر رہا ہے تو کہنا کہ اس کا افلاطون سے ضرور فرق بیان کرو تو آپ سچے ہیں، ورنہ تو آپ بھی افلاطونی ہیں۔ یہ غیر علمی اور غیر سائنٹفک رویہ ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے جو بڑے بڑے اوتار؛ رام چندر جی، کرشن جی مہاراج وغیرہ آئے ہیں، ان کے بارے میں مرزا مظہر جانِ جاناں جیسی معتبر علمی وصوفی شخصیت نے کہا ہے کہ: ''ہوسکتا ہے کہ یہ بھی انبیاؑ ہوں، لہٰذا ان کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے۔''(84) ظاہر ہے یہ لوگ حضورؐ سے پہلے کے ہیں۔ ان کی تعلیمات بھی بعد میں تحریف در تحریف سے گزر کر آج ہمارے سامنے دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں اور افسانے بن کر رہ گئیں۔ اب اگر افلاطون نے عالم مثال دریافت کیا اور اس پر اُس نے گفتگو کی ہے۔ اور افلاطون کے شاگردوں نے اس کی تشریحات وتعبیرات کی ہیں۔ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔

سوال: آپ نے بتایا کہ عمل کے پیچھے خیال ہیں اور خیال کے پیچھے ایک پورا سسٹم ہے۔ جبلت کے بارے میں آپ نے رسول اللہؐ کی حدیث سنائی کہ پہاڑ تو تبدیل ہوسکتا ہے، لیکن انسان نہیں۔ اگر وہ بُرا ہے تو جبلی طور پر بُرا ہے۔ تو اس میں انسان کا شرف و وقار کیسے ہوا؟ گویا انسان کو اللہ تعالیٰ نے مجبورِ محض پیدا کیا ہے۔ اس کا حل کیا ہے؟

جواب: دیکھیں! یہ سوال جب صحابہؓ نے حضورؐ سے کیا تھا تو حضورؐ نے فرمایا تھا:

''**إعملوا فكلّ ميسّر لما خُلق لهٗ.**''(85)

(تمھارا کام عمل کرنا ہے، عمل کرتے رہو اور اس عمل کے مطابق نتائج نکلیں گے۔)

دراصل جبلت کے دو پہلو ہیں، ایک پہلو وہ ہے جو غیر متبدل ہوتا ہے اور ایک پہلو وہ ہے، جو ریاضت، مجاہدے اور اپنے ارادے سے فیصلے کرنے سے تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اسی لئے تو ہم کسی کام کی مشق کرتے ہیں، عمل کرنے کا نظام بناتے ہیں، یا کسی کام کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ہم نے تعلیمی نظام بنایا، ہم نے تعلیمی ماحول مہیا کیا ہے اور اس کے لیے کچھ معیارات طے کیے ہیں کہ جو لوگ اس کو پڑھ کر نکلیں گے، اور اتنے نمبر لیں گے، وہ پاس ہوجائیں گے۔ اور جو اتنے نمبر نہیں لیں گے، وہ فیل ہوجائیں گے۔ اگر انسان میں یہ تغیر وتبدل نہ ہو تو پھر تو یہ نظامِ تعلیم ہی نہیں ہونا چاہیے۔ یونیورسٹیاں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ ملک میں نظام بھی نہیں ہونا چاہیے۔ ریاست کی اتھارٹی بھی نہیں ہونی چاہیے۔ پھر جیسا اللہ میاں ہمارے ساتھ معاملہ کرے گا، ویسا ہوجائے گا۔ حال آں کہ اس جبلت کو بدلنے کے لیے ہم مدرسہ بھی کھول کر بیٹھے ہوئے ہیں، مسجد بھی، یونیورسٹی بھی، کالج بھی، لیکن جب دین کا معاملہ آئے اور دین کے اعمال کی بات آئے تو وہاں ہم جبلت کی بنیاد پر کہہ دیتے ہیں کہ: ''مقدراں دی کھیڈ اے'' (مقدر کا کھیل ہے)۔ اس لیے یہ دو متضاد رائے نہیں ہونی چاہئیں۔

بات یہ ہے کہ جبلت کا ایک پہلو وہ ہے، جو تربیت سے بدل جاتا ہے۔ اب دیکھیں ایک جاہل آدمی تھا، اس کو آپ نے تربیت دی تو وہ عالم بن گیا۔ اس کے اندر ایک مہارت پیدا ہوگئی اور ملکہ پیدا ہوگیا۔ ایسے ہی دین کے علوم کا بھی معاملہ ہے کہ جیسے اسلام کی تعلیمات آدمی کی استعداد نکھارتی ہیں تو اس کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے، اس کے اندر وہ علوم منتقل ہوجاتے ہیں۔

سوال: آپ نے ارشاد فرمایا کہ علوم کے ذرائع تین چیزیں ہیں: عقل، نقل اور کشف۔ مگر کشف کی حقیقت صرف وہی

شخصیت جان سکتی ہے، جو اس کی ماہر ہو۔ اس کی تصدیق کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایسی چیز کو جب ہم دین کی تفہیم کا ایک ذریعہ مان لیں گے، تو پھر یہ کیسے طے کر پائیں گے کہ فلاں بندے نے درست کشف بیان کیا ہے، اور فلاں بندے کا کشف درست نہیں۔

دوسری بات یہ کہ آپ نے کہا کہ عقل بھی تفہیم کے لیے ضروری ہے اور نقل بھی، اور کشف بھی، تو اللہ کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو دین آیا تھا، اس میں ان ساری چیزوں کا حصہ کس حد تک تھا اور انسانی کشف کی کیا حیثیت کیا ہے؟ تو اصل میں یہ سمجھنا ہے کہ کیا کشف کے ذریعے سے کوئی بات بیان ہوگی یا عقل کے ذریعے سے جو چیز آئے گی، وہ اس دین سے زیادہ ہوگی جو ہمیں نبی اکرمؐ سے ملی۔

جواب: یہ تمام سوالات جو کشف پر ہیں، یہی سوالات عقل پر بھی ہو سکتے ہیں کہ عقل کس کی معیاری ہوگی؟ ایک کی عقل ایک بات کہہ رہی ہے، دوسرے کی عقل دوسری بات کہہ رہی ہے، تیسرے کی عقل اس سے مختلف کہہ رہی ہے تو یہ سوال تو ہم عقل پر بھی اٹھا سکتے ہیں کہ آپ کی عقل کے مطابق ایک چیز ثابت ہے تو دوسرے کے لیے کیوں حجت ہو؟

ایسے ہی احادیث آپ کے پاس منقول ہو کر آئی ہیں۔ ایک ہی راوی ہوتا ہے۔ اس پر ایک ناقدِ حدیث اس کو کذاب یا دجال تک کہہ دیتا ہے اور اُسی راوی کے بارے میں دوسرا مجتہد کہتا ہے کہ اس سے بڑا نیک بندہ کوئی نہیں اور وہ عادل ہے تو وہاں ایک ہی نقل اور ایک ہی راوی کے بارے میں ناقدین اور مجتہدین کی اجتہادی رائے سے فرق آجاتا ہے۔ اس لیے یہ تو ایک اصولی بات ہے کہ یہاں ہر آدمی کے کشف، ہر آدمی کی عقل یا ہر آدمی کے نقل کی بات نہیں ہو رہی۔

بات تو یہ ہو رہی ہے کہ علم کے یہ تین ذرائع ہیں اور جو معیار کے طور پر اس کے اہل افراد رہے ہیں، ان میں سب سے اعلیٰ ترین درجہ انبیا علیہم السلام کا ہے۔ وہ مسلمہ شخصیات ہیں۔ ان کی عقل بھی، ان کی نقل بھی اور اُن کا کشف بھی، تینوں ہی معتبر ہوتے ہیں۔ ایسے ہی صحابہؓ ہیں، تابعینؒ ہیں، یا وہ اولوالعزم مجددین ہیں، جن کے اندر یہ کیفیت رہی ہے۔

عقل کے حوالے سے ہمارے ہاں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ دین کے اندر عقل کا کوئی دخل نہیں۔ دین تو خالصتاً بس اللہ نے اوپر سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک حکم نامہ بھیج دیا اور نعوذ باللہ آپؐ نے ایک ڈاک پہنچانے والے کی حیثیت سے قرآن کی شکل میں ایک بند لفافہ لوگوں تک پہنچایا ہے اور انھوں نے اس کو کھول کر لوگوں کر پڑھ کر سنا دیا۔ قطعاً ایسا نہیں!

وہی کشف معتبر ہوتا ہے، جو عقل اور نقل کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے ہی وہ عقل صحیح ہے، جو کشف اور نقل صحیح کے مطابق ہو۔ اور نقل صحیح وہ ہے، جو عقل سلیم اور کشفِ صحیح کے مطابق ہوتی ہے۔ جب آپ ﷺ کی جسمانی قوت چالیس مردوں سے زیادہ ہے تو آپ ﷺ کی عقل بھی بہت اونچے درجے کی ہے۔ جب اتنی بڑی عقل تھی تو آپ نے اتنے بڑے علم کو اپنے اندر ضبط کیا اور اتنے ہی اونچے اور بہت ہی بہتر طریقے سے لوگوں تک اُسے منتقل کیا ہے۔ پھر لوگوں سے دریافت کیا کہ: ''ألا! ھل بلّغتُ؟'' (86) (کیا میں نے تمھیں پیغام پہنچا دیا؟) یعنی میں نے ''نقل'' پوری پوری لوگوں تک پہنچا دی ہے۔

علم کے ان تینوں ذرائع کا ثبوت قرآن میں موجود ہے۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (87) وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ (88) کہہ کر قرآن نے بار بار عقل کو غور وفکر کی دعوت دی ہے۔ اور شعور کی بنیاد پر انبیا علیہم السلام کو ماننے کی دعوت دی ہے۔ اور ''اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ'' (89)

www.rahimia.org

کہہ کر ظن و گمان وغیرہ کی تردید کی ہے۔ اس طرح عقل و شعور کی بنیاد پر دوٹوک اور قطعی بات انبیاء علیہم السلام ہی کی ہے۔ علم کی اصل بنیاد تو انبیا علیہم السلام ہی ہیں۔ وہی حجت ہیں۔ کسی ولی کا کشف دوسرے پر حجت نہیں ہوتا۔ وہ حجت تبھی بنے گا کہ اُس کشف کے ساتھ نقل صحیح کی بھی حجت موجود ہو اور اس کے ساتھ عقل سلیم بھی اس کی مؤید ہو۔ اس لیے محض کشف ہو اور باقی دو نہ ہوں، تو تب بھی نقص ہے۔ صرف عقل ہو اور باقی دو نہ ہوں، تب بھی نقص ہے۔ خالی نقل ہو اور عقل اور کشف دونوں نہ ہوں، تب بھی کمزوری اور نقص ہے۔ جامع ترین اولوالعزم رہنمایانِ قوم، ان تینوں ذرائع علم کو استعمال میں لاتے ہیں۔

یہاں یہ بتانا مقصود ہی نہیں کہ یہ تینوں چیزیں ہر آدمی کے لیے لازمی اور ضروری ہیں۔ جملے کی تعبیر میں فرق ہے کہ تینوں ذرائع علم ہیں، جس کے پاس یہ تینوں ذرائع علم ہیں، وہ رہنما بنتا ہے۔ اور جس میں یہ ذرائع علم استعمال کرنے کی طاقت یعنی؛ عقلی، نقلی اور کشفی طور پر بات سمجھانے کی اہلیت ہوگی، وہ صحیح نتیجہ پیدا کرے گا اور وہ درست ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ ہر دور کے علمی تقاضے ہوتے ہیں۔ کوئی بھی شخصیت ان علمی تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ہی اپنا علمی فلسفہ تشکیل دے رہی ہوتی ہے۔ حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے حوالے سے کوئی شک نہیں کہ اُن کا ذہن بڑا ہے، لیکن وہ بھی تو ایک دور اور ایک عرصے کی پیداوار ہیں۔ آج دور کے تقاضے بدلے ہوئے ہیں۔ تو آج کے کسی اَور صاحب کو یہ حق کیوں نہیں ہے کہ وہ اپنے تقاضوں کے حساب سے جو سمجھا ہے، وہ بیان کرے، وہ شاہ صاحبؒ کا پورا فلسفہ کیوں اختیار اور بیان کرے؟

جواب: کل اس پر گفتگو ہوئی تھی کہ شاہ صاحبؒ نے انسانی سوسائٹی کا تجزیہ کیا۔ اور تجزیے میں تین باتیں رکھی گئیں تھیں: فکری انتشار کا ہونا، سیاسی عدمِ استحکام اور طبقاتی نظام کا ہونا یعنی امیر کا امیر سے امیر تر ہونا اور غریب کا غریب سے غریب تر ہونا۔ ہندوستان کی سوسائٹی کے ڈھانچے میں جو بنیادی انتشار کی حالت 1762ء میں تھی، اب دوسو سالہ غلامی کے نتیجے میں مزید گہری ہوئی اور آج پاکستان کے ستر سال گزرنے کے باوجود وہ مزید گنجلک ہوتی چلی گئی۔ کیا دور کے ان حالات میں کوئی تبدیلی آئی ہے؟ کیا ہم نے شاہ صاحبؒ سے لے کر اب تک کے دو ڈھائی سو سالہ دورانیے میں اپنی حالت بدل کر ایک نئے ماحول اور اُس کے حوالے سے اپنے آپ کو تیار کر لیا ہے کہ اب ہمیں ایک نئے نظامِ فکر و عمل کی ضرورت پیش آ رہی ہے؟ پہلی ضرورت تو یہی ہوگی کہ جس بنیاد پر مسائل کے حل کرنے کا ایک جامع نظام دیا گیا، پہلے اُس پر تو گفتگو ہو۔ اس چیز کو تو درست کر لیا جائے۔ وہ درست ہو جائے تو آگے بڑھ کر اگلے دور کے جو تقاضے ہیں، اُن کو پورا کیا جا سکتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دو ڈھائی سو سالہ دور میں علمی حوالے سے اگر ارتقا ہوا ہے تو فلسفۂ مادیت میں بھی ہوا ہے۔ مادی فلسفے میں جدید یورپ نے سرمایہ داری کے ماتحت یا سوشل اِزم کے ماتحت نئی نئی چیزیں تخلیق کی ہیں۔ نئے پیداواری ذرائع سامنے آئے ہیں۔ نئے سسٹم اور پروسیجر طے ہوئے ہیں۔ یعنی تجرباتی اور مشاہداتی بنیاد پر کام ہوا ہے۔ جب کہ نقل کی اساس پر ان چیلنجز کو حل کرنے یا کشف کی اساس پر ان مسئلوں کو حل کرنے یعنی دین کی اساس پر بنیادی کام کرنے کے حوالے سے کوئی کام نہیں ہوا ہے۔

اس بات کو کہنے کی اجازت دیجیے کہ انگریزوں کے تسلط کے بعد سے لے کر اب تک کے اس ڈھائی سو سالہ دور میں چاہے مسجدوں اور مدرسوں کا طرزِ عمل ہو، یا اس سے باہر مذہب کی تعبیرات کے حوالے سے ہو، وہ یورپ کے اثرات اور اُس کے مادی

فلسفے سے متاثر ہونے کے نتیجے میں سامنے آئی ہیں۔ یا اُن کے ردِعمل کی کیفیات کے ساتھ آئی ہیں یا یورپ کے افکار سے دفاع کے نقطہ نظر سے کچھ چیزیں سامنے آئی ہیں۔ اور اس تناظر میں بھی کچھ جزئیات لے لی گئی ہیں اور باقی چیزیں چھوڑ دی گئیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ردِعمل کی نفسیات سے ہمیں باہر نکلنا چاہیے اور ہمیں اس سے بھی باہر نکلنا چاہیے کہ ہر حال میں دوسروں کو فتح کرنا ہے۔

ہم جب دین اسلام کی بات کرتے ہیں تو اس کا جامع فکر و عمل امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے مرتب اور مدوّن کیا ہے۔ اُن کے بعد آنے والے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگوں نے اس جامعیت کو برقرار رکھا ہے۔ اسی جامع فکر و عمل میں مسائل کے حل کا راستہ ہے۔ ان لوگوں پر کوئی غیر اسلامی فکر اثر انداز نہیں ہوا۔ یورپین مادی تحریک یا مادی خواہشات کا ان پر کوئی غلبہ نہیں ہے۔ لہٰذا کم از کم ہم اس جامع فکر و عمل کا مطالعہ کریں۔ ہم ولی اللّٰہی فکر کی دعوت دیتے ہیں، اسے کسی پر مسلط نہیں کرتے۔

شاہ صاحبؒ نے لکھا ہے کہ میں اپنے ماننے والوں کو کہتا ہوں کہ وہ اپنی بات کو کسی کے اوپر طاقت کے بل بوتے پر مسلط نہ کریں۔ جو نہیں مانتا اُس کو آزادی ہے۔ ہم اُس کی آزادی کا احترام کرتے ہیں۔ جو مانتا ہے تو ٹھیک ہے، اُسے سکھائیں اور سمجھائیں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ پچھلے دو ڈھائی سو سال سے ہمارے مسائل کے حل کرنے کے لیے علومِ قرآنیہ، علومِ حدیثیہ، علومِ فقہیہ، فلسفہ، سیاست، سماج اور معاش وغیرہ کے حوالے سے جتنی بھی گفتگو ہے، وہ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بعد سے لے کر اب تک اتنی جامعیت کے ساتھ کسی نے نہیں کی۔ اس لیے اس پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس کو سیکھنا اور سمجھنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ ایک نشست یا چند مجالس میں تو ہم شاہ صاحبؒ کا مکمل فکر و فلسفہ نہ پڑھ سکتے ہیں، نہ سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تو ابھی ایک تعارفی سلسلہ ہے۔ جب ہم اس کو ایک مستقل بنیاد بنا کر پڑھیں گے تو یقیناً سوچ کے زاویے بدلیں گے۔ چیزیں مزید نکھریں گی۔ مزید سوالات ہوں گے، اُن کے ذریعے سے مزید نتائج سامنے آئیں گے۔

صدارتی کلمات

پروفیسر ڈاکٹر حافظ عبدالرحیم
چیئرمین شعبۂ عربی بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

الحمد للّٰہ الّذی خلق الإنسان و علّمہٗ البیان. و الصّلوٰۃ و السّلام علٰی من اوتی جوامع الکلم و حسن البیان. و علٰی آلہٖ و صحبہٖ و من تبعہٗ بإحسان. قال اللّٰہ تعالیٰ:

إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ قُرْءَٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (90) **صدق اللّٰہ العظیم.**

رئیس قسم العلوم الاسلامیہ سابقاً الدکتور سعیدالرحمن و الأخ الشّیخ المفتی عبدالخالق آزاد نقول بالعربیۃ ''الحُرّ''، یعنی المفتی عبدالخالق الحُرّ رائے بوری. و الإخوان و الأخوات. الطّلّاب و الطالبات، و الباحثین و الباحثات! احییکم تحیّۃ طیبۃ مبارکۃ من عنداللّٰہ و أقول اَلسّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہٗ.

www.rahimia.org

قبل هٰذهِ الجلسة سعادة الدّكتور سعيدالرّحمٰن هاتفني و اتّصل بالهاتف، و قال لي: أنا أكلّفك كرئيس لهٰذهِ الجلسة العلمية المباركة، و هٰذهِ الجلسة العِلمية ليس بحسب، بل نقول هٰذهِ الجلسة فكرية، و فلسفية، و هٰذا شيء جديد، لأنّا نتحدّث عن فلسفة شاه ولي اللّٰه. ماشاء اللّٰه! و في هٰذهِ الجلسة نحن سمعنا هٰذا الشّيخ المفتي عبدالخالق و هو ألقىٰ المحاضرة بأسلوب مميّز، و أنّ هٰذهِ المحاضرة كانت جامعة و شاملة.

سب سے پہلے میں ڈاکٹر سعیدالرحمٰن صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مجھے ڈاکٹر صاحب نے کچھ دیر پہلے ہی فون کیا تھا کہ آپ آئیں یہاں پر صدارت کریں، میں نے کہا: میں تو اس کا اہل نہیں ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ **نحن نجعلك أهلاً**۔ ہم آپ کو اہل بنا دیتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیں کہ میں اہل ہوں یا نہیں ہوں۔ پھر میں تو بڑوں کی بات مانتے ہوئے یہاں پر آ گیا ہوں۔ میرے لیے یہ ایک خوشی اور سعادت کا موقع ہے۔ بڑی خوشی ہوئی مجھے اس سے۔ اور خاص طور پر یہ جو شعبۂ علومِ اسلامیہ کا ایک سلسلہ چل رہا ہے محاضرات کا مختلف موضوعات پر، یہ نہایت مفید اور بہت فائدہ مند ہے۔ کیوں کہ طالبِ علم کچھ کتابوں سے علم حاصل کرتا ہے، کچھ لائبریریوں سے حاصل کرتا ہے، کچھ یہ محاضراتِ عامہ ایک خاص طرز اور جامع ہوتے ہیں، تو اس سے بھی بہت زیادہ علم حاصل کرتے ہیں۔

ایک وقت تھا کہ جب ہم طالبِ علم تھے، اُس وقت ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه''، شاہ ولی اللہ کی کتاب کا نام سنتے تھے۔ اُس وقت بھی عام آدمی، عام مدرّس یا عام عالم نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اس کو پڑھانے والے خاص قسم کے استاد تھے۔ آپ نے نام سنا ہوگا ڈاکٹر عبدالواحد ہالی پوتہ کا، وہ اس کتاب کے بڑے ماہر تھے، بڑے شوق سے پڑھاتے تھے طلبا کو اور ٹائم بھی دیتے تھے۔ جب چاہیں، جس طرح چاہیں، جس وقت چلے جائیں اُن کے پاس، وہ پڑھانے کے لیے تیار ہوتے تھے۔

ایک نام میں نے بچپن میں سنا، وہ تھے مولانا محمد صدیق، منڈی یزمان کے رہنے والے تھے۔ اور فکرِ ولی اللّٰہی پر اُن کا بڑا مطالعہ اور بڑی کتابیں اُن کے پاس تھیں۔ اُن سے بھی ہم کبھی کبھی یہ باتیں سنا کرتے تھے۔ اور میرا ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' سے بھی تھوڑا سا تعلق یہ ہے کہ ہمارے ہاں شعبۂ عربی میں بھی پڑھائی جاتی ہے، اس کا **باب الخلافة** ہمارے ہاں پڑھایا جاتا ہے۔ اور میں ہی پڑھا رہا ہوں۔ **عِقد الجيد في مسئلة الاجتهاد و التّقليد** شاہ صاحبؒ کی ایک بڑی مشہور کتاب ہے، یہ چھوٹا سا ایک کتابچہ ہے۔ اور بڑا مفید اور بہت علمی ہے۔ شاہ صاحبؒ کا ایک قصیدہ بھی ہے: **اطيب النغم في مدح سيّد العرب و العجم.**

آج مولانا صاحب نے ہمیں ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کا ایک دو گھنٹے میں ایک نقشہ پیش کر دیا۔ نہ صرف ''حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه'' کا، بلکہ فلسفہ شاہ ولی اللہ اور فکرِ شاہ ولی اللہ، ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اسی سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ایک آدمی کا سو سال کا مطالعہ ایک طرف، مگر ایک صاحبِ علم کے ساتھ ایک گھنٹے کی مجلس زیادہ حاوی ہے اور مفید ہے۔ جیسے آج ہم نے دیکھا کہ کتنا ہم نے استفادہ کیا اور ہمیں اس سے فائدہ حاصل ہوا۔ مولانا صاحب نے جو ڈسکشن کی، یہ بھی بہت اچھی بات ہوئی۔

جو یہ کشف کا لفظ موضوعِ بحث بن رہا تھا، کشف کا کوئی ایسا خطرناک معنی نہیں ہے، کشف کا معنی ہوگا کھلنا۔ وہ چیزیں جو پیچھے سے چلی آ رہی تھیں، بکھری ہوئی تھیں، اُن کو سمیٹنے کا آئیڈیا اور خیال کھل کر سامنے آ گیا ہے۔ مطلب ہے کہ کوئی ایسی نئی چیز

www.rahimia.org

نہیں ہے، جس سے ہم خوف زدہ ہوں کہ شاہ ولی اللہ سے پہلے جو چیزیں تھیں، جیسے مولانا صاحب نے اشارہ کیا عز الدین ابن عبدالسلامؒ کا اور خطابیؒ کی طرف کہ اُنھوں نے جزوی طور پر ان پر کام کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر ہمیں جو ماہرینِ علومِ اسلامیہ ہیں، اُن کوتو خاص طور پرضرور پڑھنا چاہیے۔ کیوں کہ علومِ اسلامیہ بالخصوص اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا اقتصادی نظام، اسلام کا معاشرتی نظام، وہ شاہ ولی اللہ کے فکر کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام اور اقتصادی نظام اور معاشرتی نظام، یہ اختیاری مضمون کے طور پر ہیں۔لیکن یہ اختیاری مضمون کے طور پر نہیں ہونے چاہئیں، ان کی بہت اہمیت ہے۔ ان کو لازمی مضمون کی حیثیت دینی چاہیے۔

مولانا صاحب بات کررہے تھے جبلت کی۔ جبلت ایک فطری چیز ہے۔ جیسے کہا جاتا ہے: **جُبلت النّفوس علیٰ الذّکور**، یعنی انسان کی خواہش یہ ہے کہ بیٹا ہو۔ خواہش اُس کی یہی ہے،مگر بیٹی ہوجاتی ہے تو سمجھوتہ کرلیتا ہے۔لیکن خواہش اُس کی ختم نہیں ہوتی۔ جبلت نہیں ختم ہوگی۔ اُس کی تمنا رہے گی۔ وہ فطرت،فطرت ہی ہوتی ہے۔ وہ بدلتی نہیں،لیکن بعض چیزیں اعمال کی وَجہ سے جو صفات ہیں، اَخلاق ہیں، بدل جاتی ہیں۔ اُن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ جو نہ بدلنے والی چیزیں ہیں، وہ اَور ہیں اور جو بدلنے والی چیزیں ہیں، اَور ہیں، اس کو تبدیل (modify) کیا جاسکتا ہے۔

میں اسی کے ساتھ پھر دوبارہ سب حضرات کا شکریہ ادا کروں گا اور آخر میں مولانا صاحب کا بھی کہ انھوں نے بہت اچھے علمی اور مدلل انداز میں پریزنٹیشن اور لیکچر دیا۔ بہت ہی متأثر کن اور بہت ہی زیادہ مؤثر تھا۔ خاص طور پر مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اور آپ کو بھی یقیناً فائدہ ہوا ہوگا اور میں نے آج سے ارادہ کرلیا ہے کہ میں بھی اگلے لیکچرز میں بہ طور سامع کے آؤں گا۔ ان شاءاللہ۔

اسی کے ساتھ میں سب حضرات کا، ڈاکٹر عبدالقدوس صہیب صاحب کا، اور تمام منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اخیراً أدعوا اللّٰہ تعالیٰ ان یوفقنا جمیعا لخیر و سعادۃ

و السّلام علیکم و رحمۃ اللّٰہ و برکاتہ.

حوالہ جات وحواشی

1۔ القرآن 269:2

2۔ **صحیح بخاری**، ج 1، کتاب العلم، حدیث نمبر 71۔

3۔ **تکمیل الأذھان**، ازحضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ، الباب الرّابع فی بیان تطبیق الآراء، ص123، طبع: نصرۃ العلوم، گوجرانوالا۔

4۔ **عبقات**، از شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، عبقہ نمبر2، ص5، طبع: مجلس علمی، کراچی، ۱۳۸۰ھ/ 1960ء۔

5۔ **سطعات**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سطعہ نمبر16، ص28-26، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ، 1964ء۔

6۔ **تکمیل الأذھان**، ص27-126۔

7۔ حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ ''عبقات'' میں حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا نام تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''و قد قادنی ھادی التّوفیق فی طرق تحصیل الیقین و التحقیق حتّٰی فُزت بمطالعۃ کتابی ''اللّمحات و السّطعات'' و

www.rahimia.org

ما ضاهاهما من المختصرات من مصنّفات أفضل المحقّيقن، و فخر المدقّقين، اعتصام الحكماء، و إمام العرفاء، و أعلمهم باللّٰه، الشّيخ ولى اللّٰه أفاض اللّٰه علينا من بركاته.'' (عبقات، مقدمه، ص3-2)

(جب مجھے توفیق کی ہدایت دینے والے (اللہ تبارک وتعالیٰ) نے مجھے یقین اور تحقیق کے حصول کے طریقوں کی طرف کھینچا، یہاں تک کہ میں ''لمحات اور سطعات'' جیسی دو کتابوں کے مطالعے میں کامیاب ہوا۔ نیز اسی طرح کی ایسی مختصر کتابیں جو مسائل اور احکام کے تحقیقی دلائل دینے والوں میں سب سے افضل، اور اُن دلائل کے بھی دلائل دینے میں بلند تر مقام رکھنے والے، حکما اور فلاسفہ کا مرکز ومحور، عرفا اور صوفیا کے امام اور اُن میں سب سے زیادہ اللہ کی معرفت اور علم رکھنے والے، شیخ ولی اللہ — اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی برکات نازل فرمائے — نے لکھی ہیں۔)

8۔ **تكميل الأذهان**، ص123۔

9۔ القرآن 11:93

10۔ **أنفاس العارفين، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، الجزء اللّطيف فى ترجمة العبد الضّعيف** (فارسی)، ص200، طبع ملتان۔

11۔ **التّفهيمات الإلٰهيه**، تفہیم 243 (مکتوبِ مدنی)، ج:2، ص261۔ طبع حیدرآباد، سندھ۔

12۔ ایضاً، تفہیم نمبر208، جلد2، ص211۔

13۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مقدّمہ، ص30، طبع مکتبہ حجاز، دیوبند (انڈیا)۔

14۔ ایضاً۔ 15۔ القرآن 14:40۔

16۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، ج:1، ص56-55۔ 17۔ ایضاً، ص55۔

18۔ ایضاً، ص57۔ 19۔ القرآن 101:6۔

20۔ **رواه البخارى**، حدیث نمبر3191۔ 21۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، ج:1، ص57۔

22۔ القرآن 7:11

23۔ **التّفهيمات الإلٰهيه**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ج1، تفہیم نمبر18، ص75۔

24۔ القرآن 15:55۔ 25۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، ج:1، ص57۔

26۔ القرآن 30:21 27۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، ج:1، ص59۔

28۔ القرآن 32:5-4۔ 29۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه**، ج:1، ص59۔

30۔ ایضاً، ص60۔ 31۔ ایضاً، **باب ذكر عالم المثال**، ص61-60۔

32۔ القرآن 6:66۔

33۔ **عبقات، خاتمة الكتاب فى تحقيق عالم المثال، عبقه نمبر7**، طبع: مجلس علمی، کراچی۔

34۔ **سنن ترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله ﷺ، باب و من سورت الاعراف**، حدیث نمبر3075۔

35۔ **صحيح بخارى، كتاب الصلوٰة**، حدیث نمبر349۔

36۔ القرآن 69:38۔

37۔ **لمحات**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، لمحہ نمبر34۔

38۔ **أنفاس العارفين**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، **الجزء اللّطيف فى ترجمة العبد الضّعيف** (فارسی)، ص200، طبع ملتان۔

39۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، باب ذكر سنّة اللّٰه**، ص71-70۔

www.rahimia.org

40۔ القرآن 43:35۔
41۔ صحیح بخاری، کتاب الصّلٰوۃ، حدیث نمبر 349۔
42۔ حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، ص 76-75۔
43۔ القرآن 72:33۔
44۔ القرآن 66:6۔
45۔ القرآن 4:95۔
46۔ سطعات، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سطعہ نمبر 15، ص 25-24۔
47۔ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب ما یذکر فی الطّاعون، حدیث نمبر 5729۔
48۔ حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، باب انشقاق التکلیف من التقدیر، ص 86-85۔
49۔ ایضاً، ص 88-87
50۔ ایضاً، باب اقتضاء التکلیف المجازات، ص 92۔
51۔ أنفاس العارفین، الجزء اللّطیف فی ترجمة العبد الضّعیف (فارسی)، ص 200۔
52۔ رواہ احمد، ج 6، ص 443۔ و مشکوٰۃ المصابیح، باب الإیمان بالقدر، حدیث نمبر 123۔
53۔ آپؐ نے فرمایا: ''أُعطیتُ قوّۃ أربعین فی البطش و النّکاح.'' (المعجم الأوسط، حدیث نمبر 567) (مجھے نکاح اور گرفت کے سلسلے میں چالیس (جنتی) مردوں کی قوت دی گئی ہے۔)
54۔ القرآن 53:9-8۔
55۔ حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، باب فی أسباب الخواطر الباعثة علی الأعمال، ص 98۔
56۔ ایضاً، باب لصوق الأعمال بالنّفس و إحصائها علیها، ص 99۔
57۔ القرآن 49:18۔
58۔ رواہ مسلم، 133:16۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الدعوات، باب الاستغفار، حدیث نمبر 2326۔
59۔ حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، باب لصوق الأعمال بالنّفس و إحصائها علیها، ص 02-101
60۔ ایضاً، مبحث السّعادۃ، باب 4، ص 160۔
61۔ ایضاً، ص 161۔
62۔ ایضاً، ص 162۔
63۔ ایضاً، ص 163۔
64۔ ایضاً۔
65۔ ایضاً، باب الحجب المانعة عن ظهور الفطرۃ، ص 167۔
66۔ ایضاً، مبحث البرّ و الإثم، مقدمه فی بیان حقیقة البّر و الإثم، ص 173۔
67۔ ایضاً۔
68۔ ایضاً، باب تعظیم شعائر اللّٰه تعالٰی، ص 209۔
69۔ البُدُور البازغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، المقالة الثّالثة فی بیان الملل و الشّرائع، فصل 1، ص 41-240، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ۔

www.rahimia.org

70۔ ایضاً، ص 241۔ 71۔ ایضاً، ص 43-242۔

72۔ القرآن 13:42۔ 73۔ القرآن 48:5۔

74۔ **صحیح بخاری، کتاب التّیمّم**، حدیث 335۔

75۔ **حُجَّةُ اللّٰهِ الْبَالِغَه، مبحث السابع، باب الفرق بین المصالح والشرائع**، ص 363۔

76۔ ایضاً، ص 364 77۔ ایضاً، ص 366۔

78۔ **الفوز الکبیر**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، باب چہارم در بیانِ فنونِ تفسیر، فصل در باقی لطائف ایں باب، ص 153، طبع فرید بک ڈپو، دہلی۔

79۔ **صحیح بخاری، کتاب التّیمّم**، حدیث 335۔

80۔ **سطعات**، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سطعہ نمبر 15، ص 25۔

81۔ علی گڑھ کالج کے بانی سرسیّد مرحوم نے اصولِ تفسیر پر ایک کتاب ''تحریر فی اصول التفسیر'' لکھی ہے۔ اس میں چوتھا اصول بیان کرتے ہوئے تحریر کیا ہے: ''یہ بھی مسلم ہے کہ قرآن مجید بلفظہٖ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب پر نازل ہوا ہے یا وحی کیا گیا ہے۔ ...مگر میں اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ صرف مضمون القا کیا گیا تھا اور الفاظِ قرآن آں حضرتؐ کے ہیں، جن سے آں حضرتؐ نے اپنی زبان میں جو عربی تھی، اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ **و العجب ثمّ العجب علٰی ما قال الإمام حُجَّة الإسلام بل حُجّة اللّٰه فی الأنام الشّاه ولی اللّٰه الدّهلویؒ فی کتابه ''التّفهیمات الإلٰهیه''** ...مگر یہ قول شاہ صاحب کا عقل اور نفس الامر دونوں کے مخالف ہے۔''
(تحریر فی اصول التفسیر، از سرسیّد احمد خاں، الاصل الرابع، ص 32، طبع: خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1995)
یہاں سرسیّد مرحوم نے شاہ صاحبؒ کی طرف جس قول کی نسبت کی ہے، اس کا تعلق دائرۂ ''تدلیات'' میں قرآن حکیم کے الفاظ اور معانی کی تعیین کی بحث سے ہے۔ نزولِ قرآن سے متعلق شاہ صاحبؒ کی یہ تصریح ''سطعات'' میں بڑی وضاحت کے ساتھ موجود ہے:
''اگر در نفسِ پیغمبر برکاتِ الٰہی از دو میزاب فرود آید: (۱) میزابِ اوّل اثرِ دریائے تشریع — چناں کہ حقیت ہفت گانہ اورا بیان کردیم — (۲) میزابِ دوم از دریائے سِرّ کلام و تعیینِ وضعی از آں منزّل بر قلبِ پیغمبر قرآن باشد۔'' (سطعات، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سطعہ نمبر 22، ص 34، طبع: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، حیدرآباد، سندھ) سرسیّد مرحوم نے شاہ صاحبؒ کی جو عبارت نقل کی ہے، اس کی سطعات کی عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اور اس طرح ''تفهیمات'' میں جو ''کلاماً الٰهیاً'' اور ''کلامُ اللّٰه'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں، وہ انھی دونوں میزابِ معنوی اور میزابِ لفظی کے تناظر میں ہیں۔ (آزاد)

82۔ القرآن 7:13۔

83۔ القرآن 24:35۔

84۔ حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ لکھتے ہیں کہ: ''ہندو دھرم خدا کا بھیجا ہوا ہے، جو ظہورِ اسلام کے بعد منسوخ ہو گیا اور رام چندر جی، کرشن جی وغیرہ کی عزت اور ان کا احترام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ممکن ہے کہ یہ خدا کے بھیجے ہوئے ولی یا پیغمبر ہوں۔'' (مکتوبات حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ، ص 85، طبع: مکتبہ برہان، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی)

85۔ صحیح بخاری، حدیث نمبر 4685۔ 86۔ ایضاً، حدیث نمبر 6785۔

87۔ القرآن 65:3۔ 88۔ القرآن 12:2۔

89۔ القرآن 148:6۔ 90۔ القرآن 2:12۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ تحریکاتِ آزادی

آزادی اور حریّت کا پیغامِ فکر و عمل

خطبہ صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ

عناوین و حواشی: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری

(حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (1851ء- 1920ء) برعظیم پاک و ہند کی وہ عظیم شخصیت ہیں کہ جنھوں نے اس خطے کی آزادی اور حریت کے لیے بیش بہا قربانی دی ہے۔ وہ ایک عظیم مفکر، مدبر اور سیاسی شعور کے حامل رہنما تھے۔ انھوں نے ''تحریک ریشمی رومال'' جیسی آزادی کی عظیم تحریک برپا کی تھی۔ انگریز سامراج کے خلاف ان کی تحریک نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ مالٹا کی جیل سے رہا ہونے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ جب واپس تشریف لائے تو یہاں تحریکِ خلافت اور تحریکِ ترکِ موالات کی قیادت کی۔ آزادی اور حریت کے تناظر میں قومی کالج کی ضرورت پیش آئی اور اس خطے کے حریت پسند رہنماؤں نے علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو اس کے افتتاح کے لیے حضرت شیخ الہندؒ کو دعوت دی گئی۔ چناں چہ بیماری کے باوجود آپؒ نے یہ دعوت قبول کی اور اس کے تاسیسی جلسے کی صدارت قبول فرمائی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ (علی گڑھ/ دہلی) کا یہ تاسیسی اجلاس مؤرخہ ۱۶/صفر ۱۳۳۹ھ/ 29/ اکتوبر 1920ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ نے کی تھی۔ اس موقع پر حضرت شیخ الہندؒ نے یہ وقیع خطبۂ صدارت پیش کیا تھا۔

یہ خطبۂ صدارت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں حضرت شیخ الہندؒ نے آزادی اور حریت سے متعلق اپنے افکارِ عالیہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی سیاسی جدوجہد کو سمجھنے کے لیے یہ خطبہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ خطبۂ صدارت کئی مرتبہ ہندوستان اور پاکستان میں طبع ہوا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ کچھ طباعتوں میں اس خطبے کی اہم عبارتیں چھوٹ گئی ہیں۔ اس خطبۂ صدارت کی اہمیت کے پیش نظر ہم نے سب سے پہلی طباعت کو سامنے رکھ کر پوری احتیاط کے ساتھ اسے مرتب کرتے ہوئے اس پر عنوانات قائم کر دیے ہیں، تاکہ اس سے استفادہ کرنا آسان ہو۔ خطبے میں حضرت شیخ الہندؒ نے بہ کثرت آیات و احادیث سے استدلال کیا ہے۔ ان کی تخریج کرتے ہوئے ضروری مقامات پر حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس خطبۂ صدارت کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کی وہ تحریر بھی شامل کی گئی ہے، جو ''تحریکِ عدمِ تعاون'' کے حوالے سے علی گڑھ کے طلبا کے سوالات کے جوابات میں لکھی گئی تھی۔ اس سے بھی حضرت شیخ الہندؒ کے سیاسی افکار و خیالات بہ خوبی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ تحقیق و تخریج کے ساتھ حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تحریریں قارئین ''شعور و آگہی'' کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سے استفادے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین! مدیر اعلیٰ)

www.rahimia.org

خطبہ صدارت

از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم
حامداً و مصلّیاً. امّا بعد!

(شکریے کے کلمات)

جلسوں کی عام رَوِش کا اقتضا (تقاضا) یہ ہے کہ میں سب سے پہلے اس عزتِ صدارت پر جو ایک نہایت ہی سرفروشانہ ایثار اور شجاعانہ جدوجہد کرنے والی جماعت کی طرف سے مجھ کو مرحمت ہوئی ہے، شکرگزاری اور منّت پذیری کا اظہار کروں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ شکریہ چند وقیع اور شان دار الفاظ سے ادا نہیں ہوسکتا۔ اور نہ مجھ کو محض رسمی اور مصنوعی ممنونیت کی نمائش، اس بھاری ذمہ داری کے بوجھ سے سبکدوش کرسکتی ہے۔ جو فی الحقیقت (درحقیقت) آپ نے اس عزت افزائی کے ضمن میں مجھ پر عائد کی ہے۔

(پختہ کار، بلند خیال، ثابت قدم اور عاقلانہ طریق عمل کی ضرورت)

دو چار پھڑکتے ہوئے جملے بلاشبہ عارضی طور پر مجلس کو محظوظ کرسکتے ہیں، مگر میں خیال کرتا ہوں کہ میری قوم اس وقت فصاحت و بلاغت کی بھوکی نہیں ہے اور نہ اس قسم کی عارضی مسرتوں سے اس کے درد کا اصلی درمان ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت ہے ایک قائم و دائم جوش کی، نہایت صابرانہ ثباتِ قدم کی، دلیرانہ مگر عاقلانہ طریق عمل کی، اپنے نفس پر پورا قابو پانے کی، غرض! ایک پختہ کار بلند خیال اور ذی ہوش محمدی بننے کی۔

(دعوتِ حق کے لیے پختگی اور چُستی کی ضرورت)

میں ہرگز آپ کے لیکچراروں اور فصیح اللسان تقریر کرنے والوں کی تحقیر نہیں کرتا۔ کیوں کہ میں خوب جانتا ہوں کہ جو چیز سوئے ہوئے دلوں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے اور زمانے کی ہوا میں اوّل تموّج (پہلی تحریک) پیدا کرتی ہے، وہ یہی دعوتِ حق کا غلغلہ ڈالنے والی زبان ہے۔ ہاں! اس قدر گزارش کرتا ہوں کہ تاوقتیکہ متکلم اور مخاطب کے دل میں سعیٔ جمیلہ کا سچا جذبہ، اس کے اَخلاق میں شجاعانہ استقامت و ایثار، اس کے جوارح میں قوتِ عمل، اس کے ارادوں میں پختگی اور چُستی نہ ہو، محض گرم جوش تقریریں کسی ایسے کٹھن اور بلند پایہ مقصد میں آپ کو کامیاب نہیں کرسکتیں۔ (بہ قول امام شافعیؒ)

و کیف الوَصول إلیٰ سُعاد و دُونها
قُلل الجبال و دونهنّ حتوف[1]

(سُعاد (محبوبہ) تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے! جب کہ اس تک پہنچنے سے پہلے اونچے پہاڑوں کی گھاٹیاں اور اُن سے پہلے بہت سی ہلاکتوں کا اندیشہ ہے۔)

(مشکلات کا مقابلہ کیے بغیر کامیابی نہیں ہوتی)

اے حضرات! آپ خوب جانتے ہیں کہ جس وادیٔ پُر خار کو آپ برہنہ پا ہوکر قطع کرنا چاہتے ہیں، وہ مشکلات اور تکالیف کا جنگل ہے۔ قدم قدم پر وہاں صعوبتوں (مشقتوں) کا سامنا ہے۔ طرح طرح کی بدنی، مالی اور جاہی مکروہات (ناپسندیدہ چیزیں) آپ کے دامنِ استقلال کو اُلجھانا چاہتے ہیں، لیکن (فرمانِ نبویؐ) ''حُفّت الجنّة بالمكاره'' [2] (جنت کو مشکلات اور تکلیف دہ اُمور سے گھیر دیا گیا ہے) کے قائل (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم) کو اگر آپ خدا کا سچا رسول مانتے ہیں اور ضرور مانتے ہیں تو یقین رکھیے کہ جس صحرائے پُر خار میں آپ گامزن ہونے کا ارادہ رکھتے ہیں، اس کے راستے پر جنت کا دروازہ بہت ہی نزدیک ہے۔

(اعلیٰ مقاصد، مشکلات کی برداشت سے حاصل ہوتے ہیں)

کامیابی کا آفتاب ہمیشہ مصائب و آلام کی گھٹاؤں کو پھاڑ کر نکلا ہے اور اعلیٰ تمناؤں کا چہرہ سخت سے سخت صعوبتوں کے جھرمٹ میں سے دکھائی دیا ہے۔

(قرآن حکیم میں فرمانِ خداوندی ہے:)

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ [3]

(کیا تم کو یہ خیال ہے کہ تم جنت میں جا گھسو گے اور تمھیں اس طرح کے حالات پیش نہ آئیں گے، جو کہ تم سے پہلے لوگوں کو پیش آئے۔ ان کو سختیاں اور اذیتیں پہنچیں اور وہ اس قدر جھڑجھڑائے گئے کہ پیغمبر اور اس کے ساتھ کے مؤمنین بول اُٹھے کہ خدا کی مدد کہاں ہے؟ یاد رکھو کہ خدا کی مدد نزدیک ہے۔)

دوسری جگہ ارشادِ (خداوندی) ہے:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ [4]

(کیا تم نے یہ خیال کیا ہے کہ تم جنت میں داخل ہوجاؤ گے بِدوں (بغیر) اس کے کہ اللہ جانچ کرے تم میں سے مجاہدین اور صابرین کی۔)

ایک اَور مقام پر ارشاد ہوا ہے:

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝ [5]

(کیا لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ محض اٰمَنَّا (ہم ایمان لائے) کہنے پر وہ چھوڑ دیے جائیں گے۔ حال آں کہ ہم نے اُن سے پہلے لوگوں کی آزمائش کی ہے۔ تو ضرور ہے کہ اللہ پرکھے گا سچے اور جھوٹے لوگوں کو۔)

www.rahimia.org

(آزمائش کرنا' اللہ کا ہمیشہ سے طریقہ رہا ہے)

یہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کی سنتِ مستمرہ (ہمیشہ کا طریقہ) ہے، جس میں کسی قسم کی تبدُّل (تبدیلی) وتغیر کو راہ نہیں۔ کوئی قوم اللہ جل شانہٗ کی محبت اور اس کے راستے پر چلنے کی مدعی نہیں ہوئی، جس کو امتحان و آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا گیا ہو۔ خدا کے برگزیدہ اور اولوالعزم پیغمبر جن سے زیادہ خدا کا پیار کسی پر نہیں ہوسکتا، وہ بھی مستثنیٰ نہیں رہے۔ بے شک ان کو مظفر و منصور (کامیاب) کیا گیا، مگر کب؟ سخت اِبتلا (آزمائش) اور زِلزالِ شدید (زبردست امتحان) کے بعد۔ وہ خود فرماتے ہیں، (قرآن حکیم میں ہے) کہ:

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْـَٔسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ (6)

(یہاں تک کہ جب نا اُمید ہونے لگے رسول اور خیال کرنے لگے کہ اُن سے جھوٹ کہا گیا تھا، پہنچی اُن کو ہماری مدد۔ پھر بچا دیا جن کو ہم نے چاہا اور پھرتا نہیں عذاب ہمارا قوم گنہگار سے۔)

(دشمن کے مقابلے پر بلند ہمتی پیدا کریں!)

پس اے فرزندانِ توحید! میں چاہتا ہوں کہ آپ انبیائے مرسلین اور ان کے وارثوں کے راستے پر چلیں اور جولڑائی اس وقت شیطان کی ذُرِّیّت (انسانیت دشمن) اور خدائے قدوس کے لشکروں میں ہو رہی ہے، اس میں ہمت نہ ہاریں اور یاد رکھیں کہ شیطان کے مضبوط سے مضبوط آہنی قلعے خداوندِ قدیر کی امداد کے سامنے تارِعنکبوت (مکڑی کے جالے) سے بھی زیادہ کمزور ہیں۔

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا (7)

(ایمان دار تو خدا کے راستے میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کے راستے میں۔ پس تم شیطان کے مددگاروں سے لڑو۔ بلاشبہ شیطان کی فریب کاری محض لچر پوچ ہے۔)

(میں اپنی گم شدہ متاع کے لیے یہاں آیا ہوں)

میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں — جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں — آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا اُمیدوار ہوں۔

(خدا کے خوف سے عاری بہت سے نیک بندے!)

بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر اللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدارا! اُٹھو! اور اس اُمتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو اُن کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔ حال آں کہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اُس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاعِ قلیل (معمولی سامان) خدا کی رحمتوں اور اُس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ چناں چہ اس قسم کے مضمون کی طرف حق تعالیٰ جل شانہٗ نے ان آیات

www.rahimia.org

میں ارشاد فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۭ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۣ وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۭ (8)

(کیا تم نے اُن لوگوں کی طرف نظر نہیں کی، جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ کو روکو اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب اُن پر جہاد فرض کیا گیا تو یکا یک ان میں کا ایک فریق ڈرنے لگا آدمیوں سے خدا کے برابر، یا اس سے بھی زیادہ۔ اور کہنے لگا کہ: اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض کیا اور کیوں تھوڑی مدت ہم کو اَور مہلت نہ دی؟ کہہ دو کہ: دنیا کا فائدہ تھوڑا ہے اور آخرت اُس شخص کے لیے بہتر ہے، جس نے تقویٰ اختیار کیا اور تم پر ایک تاگے (باریک دھاگے) کے برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ جہاں کہیں بھی تم ہو، موت تم کو آدبائے گی۔ اگرچہ تم نہایت مستحکم قلعوں میں ہو۔)

(سکولوں اور کالجوں کے نونہالانِ وطن؛ میرے غم خوار)

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار — جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں — مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ (کالج) کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں — مدرسۂ دیوبند اور علی گڑھ کالج — کا رشتہ جوڑا۔

(دیوبند اور علی گڑھ کے رشتہ جوڑنے پر نکتہ چینی درست نہیں)

کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بہ ظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اُس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔

(حافظ شیرازی نے کیا خوب کہا ہے) ؎

دوشِ دیدم کہ ملائک در مے خانہ زدند
گِلِ آدم بہ سرشتند و بہ پیمانہ زدند

(گزشتہ رات میں نے فرشتوں کو دیکھا کہ مے خانے میں جمے بیٹھے تھے۔ آدم کی مٹی گوندھ رہے تھے اور (شرابِ مستی کا) پیمانہ بھر رہے تھے۔)

ساکنانِ حرم سِتر و عفاف ملکوت
با مَن راہ نشیں بادۂ مستانہ زدند

(حرم کے رہنے والے عالَمِ ملکوت کے پردے اور پاک دامنی میں ہیں، میرے ساتھ راہ نشیں مستی کی شراب

www.rahimia.org

پیے ہوئے ہیں۔)

شکر ایزد کہ میانِ من و اُو صلح اُفتاد
صوفیان رقص کناں ساغر شکرانہ زدند

(خدا کا شکر ہے کہ میرے درمیان اور ان کے درمیان صلح ہوگئی۔ صوفی حضرات رقص کر رہے ہیں اور شکرانے کی شراب کا پیالہ پی رہے ہیں۔)

جنگِ ہفتاد و دو ملت ، ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت ، رہِ افسانہ زدند

(ملت کے بہتّر فرقوں کی جنگ ہے، ان تمام کا عذر سامنے رکھ!۔ لوگ جب حقیقت نہیں دیکھتے تو افسانے گھڑتے ہیں۔)[9]

(جدید علوم سیکھنے پر اکابر دیوبند کا صحیح مؤقف)

آپ میں سے جو حضرات محقق اور باخبر ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ میرے اکابر سلف نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے یا دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتویٰ نہیں دیا۔

ہاں! یہ بے شک کہا گیا کہ اگر انگریزی تعلیم کا آخری اثر یہی ہے، جو عموماً دیکھا گیا ہے کہ لوگ نصرانیت (عیسائیت) کے رنگ میں رنگے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب اور مذہب والوں کا مذاق اڑائیں یا حکومتِ وقتیہ (مسلط برطانوی حکومت) کی پُرستش (پوجا) کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے ایک مسلمان کے لیے جاہل رہنا ہی اچھا ہے۔ اب از راہِ نوازش آپ ہی انصاف کیجیے کہ یہ تعلیم سے روکنا تھا یا اس کے اثرِ بد سے۔ اور کیا یہ وہی بات نہیں، جس کو آج مسٹر گاندھی اس طرح ادا کر رہے ہیں کہ:

''ان کالجوں کی اعلیٰ تعلیم بہت اچھی، صاف اور شفاف دودھ کی طرح ہے، جس میں تھوڑا سا زہر ملا دیا گیا ہو۔''

(غلامانہ تعلیمی نظام سے نجات کا راستہ؛ مسلم نیشنل یونیورسٹی)

بارے خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری قوم کے نوجوانوں کو توفیق دی کہ وہ اپنے نفع وضرر (نقصان) کا موازنہ کریں اور دودھ (عصری تعلیم) میں (دین کی مخالفت اور مسلط حکومت کی پوجا کا) جو زہر ملا ہوا ہے، اُس کو کسی بھپکے کے ذریعے سے علاحدہ کرلیں۔ آج ہم وہی بھپکا نصب کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں اور آپ نے مجھ سے پہلے سمجھ لیا ہوگا کہ وہ بھپکا ''مسلم نیشنل یونیورسٹی'' (جامعہ ملیہ اسلامیہ) ہے۔

(غیروں کے اثر سے آزاد تعلیم؛ بلند خیالی اور تدبر پیدا کرتی ہے)

مطلق تعلیم کے فضائل بیان کرنے کی ضرورت اب میری قوم کو نہیں رہی۔ کیوں کہ زمانے نے خوب بتلا دیا ہے کہ تعلیم سے ہی بلند خیالی اور تدبر اور ہوش مندی کے پودے نشو ونما پاتے ہیں اور اسی کی روشنی میں آدمی نجاح وفلاح (ترقی اور کامیابی) کے

www.rahimia.org

راستے پر چل سکتا ہے۔ ہاں! ضرورت اس کی ہے کہ وہ تعلیم مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو اور اَغیار کے اثر سے بالکل آزاد ہو۔ کیا بہ اعتبارِ عقائد و خیالات کے، اور کیا بہ اعتبارِ اَخلاق و اعمال کے، اور کیا بہ اعتبارِ اوضاع و اطوار (طرزِ زندگی) کے، ہم غیروں کے اثرات سے پاک ہوں۔

(قومی کالج اور مدارس محض سستے غلام پیدا نہ کریں)

ہماری عظیم الشان قومیت کا اب یہ فیصلہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنے کالجوں سے بہت سستے داموں غلام پیدا کرتے رہیں، بلکہ ہمارے کالج نمونہ ہونے چاہئیں بغداد اور قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے اور ان عظیم الشان مدارس کے، جنھوں نے یورپ کو اپنا شاگرد بنایا، اس سے پیش تر کہ ہم اس کو اپنا استاد بناتے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ بغداد میں جب ''مدرسہ نظامیہ'' کی بنیاد ایک اسلامی حکومت (خلافتِ عباسیہ) کے ہاتھوں سے رکھی گئی ہے تو اُس دن علما نے جمع ہو کر علم کا ماتم کیا تھا کہ:

''افسوس آج سے علم حکومت کے عہدے اور منصب حاصل کرنے کے لیے پڑھا جائے گا۔''

تو کیا آپ ایک ایسے کالج سے فلاحِ قومی کی امید رکھتے ہیں، جس کی امداد اور نظام میں بڑا زبردست ہاتھ ایک غیر اسلامی حکومت کا ہو۔

(آزاد یونیورسٹی کا قیام؛ ملتِ اسلامیہ کی اہم ضرورت)

ہماری قوم کے سربرآوردہ لیڈروں نے سچ تو یہ ہے کہ اُمت اسلامیہ کی ایک بڑی اہم ضرورت کا احساس کیا ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی درس گاہوں میں جہاں علومِ عصریہ کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہو، اگر طلبا اپنے (دین کے) اصول و فروع سے بے خبر ہوں اور اپنے قومی محسوسات اور اسلامی فرائض فراموش کر دیں اور ان میں اپنی ملت اور اپنے ہم قوموں کی حمّیت (حمایت) نہایت ادنیٰ درجے پر رہ جائے تو یوں سمجھو کہ وہ درس گاہ مسلمانوں کی قوت کو ضعیف بنانے کا ایک آلہ ہے۔ اس لیے (جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تاسیس کے اس موقع پر) اعلان کیا گیا ہے کہ:

''ایک آزاد یونیورسٹی کا افتتاح کیا جائے گا، جو گورنمنٹ کی اعانت اور اُس کے اثرات سے بالکل علاحدہ اور جس کا تمام تر نظامِ عمل اسلامی خصائل اور قومی محسوسات پر مبنی ہو۔''(10)

(کالج کے نونہالانِ وطن کی بلند ہمتی پر آفرین)

مجھے لیڈروں سے زیادہ اُن نونہالانِ وطن کی ہمتِ بلند پر آفرین اور شاباش کہنا چاہیے، جنھوں نے اس نیک مقصد کی انجام دہی کے لیے اپنی ہزاروں اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اور باوجود ہر قسم کی طمع اور خوف کے وہ موالاتِ نصاریٰ (انگریز حکومت سے تعاون) کے ترک (چھوڑنے) پر مضبوطی اور استقلال کے ساتھ قائم رہے اور اپنی عزیز زندگیوں کو ملت اور قوم کے نام پر وقف کر دیا۔

www.rahimia.org

(انگریز حکومت سے عدمِ تعاون کے مسئلے کی تحقیق)

شاید ترکِ موالات (انگریز حکومت سے عدمِ تعاون) کے ذکر پر آپ اس مسئلے کی تحقیق کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اُن **عامّةُ الوُرود** (عام طور پر پیدا ہونے والے) سوالات اور شبہات کے دلدل میں پھنسنے لگیں، جو اِس بہت ہی اہم و اعظم (بڑے) مسئلے کے متعلق آج کل عموماً زبانِ زد ہیں۔ اس لیے میں آپ سے اجازت چاہتا ہوں کہ آپ تھوڑا سا وقت مجھ کو اُس تحریر کے سنانے کے لیے عنایت فرمائیں جو میں نے (آپ لوگوں کی طرف سے) بعض مسائل دریافت کیے جانے پر دیوبند سے تیار کر کے بھیجی تھی۔ و هو هٰذا (اور وہ تحریر یہ ہے):

(تحریکِ عدمِ تعاون پر علی گڑھ کالج کے طلبا کا سوال نامہ)

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلے میں:

نمبر ا۔ اس وقت جو گورنمنٹ سے مدارس میں بہ ضرورت زیادتی اخراجات مدارس کی امداد لی جاتی ہے، اس امداد کا ترکِ موالات کی وَجہ سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۲۔ جو وظائف کہ سرکار کی طرف سے طلبا کو اور خطاب یافتہ اصحاب کو ملتے ہیں، ان کا لینا ان کو جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۳۔ طلبا کے ذمے والدین یا دیگر مربّیوں کو بغیر اطلاع دیے ہوئے یا اُن کی خلافِ مرضی ایسے مدارس کو چھوڑ دینا واجب ہے یا نہیں؟

نمبر ۴۔ جن (لوگوں) کا نان نفقہ (خرچ، اخراجات) طلبا کے اوپر فرضِ عین ہے، مثلاً اولاد، زوجہ یا ضعیف والدین، اُن کو چھوڑ کر ہم کو لِوجه اللّٰه (اللّٰہ کی رضا کے لیے تحریکِ) خلافت کے کام میں لگ جانا ضروری ہے یا نہیں؟

نمبر ۵۔ جن مدارس میں کہ سرکاری امداد لی جاتی ہے یا جو والیِٔ ریاست ترکِ موالات اور مسئلہ خلافت کے مخالف ہوں اور اُن سے کچھ رقم ملتی ہے، ایسے مدارس میں پڑھنا یا پڑھانا، یا اُن میں امامت و وعظ و نصیحت یا مذہبی تعلیم دینے کے امور کے انتظام کرنے کی ملازمت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۶۔ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جن کا نان و نفقہ اس کے ذمے فرض ہے، **بقدر مایکفی** (ضرورتوں کو پورا کرنے کی مقدار) خلافت کے بیت المال سے لینا جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۷۔ ان لوگوں سے کیا معاملہ رکھنا چاہیے، جو سرکاری ملازم ہیں یا ایسے مدارس میں ملازم ہیں، جن کو سرکار سے امداد ملتی ہے؟

نمبر ۸۔ مسئلہ خلافت اور ترکِ موالات میں اہلِ ہنود (ہندوؤں) سے اتحاد رکھنا اور اُن سے امداد و اعانت (یعنی خواہ مالی ہو یا زبانی یا اَور کسی قسم کی ہو) جائز ہے یا نہیں؟

نمبر ۹۔ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے ''دوامی فنڈ'' کا روپیہ یا اُس کی عمارتیں جو تقریباً چالیس لاکھ روپے کی ہیں اور کتب خانہ جو رقم کثیر کا ہے اور دیگر حوائج کی اشیا جو ہزار ہا روپے کی مالیت کی ہیں، ان تمام چیزوں کی حفاظت اور ہر چیز کو اپنے مصرف میں صَرف کرنا ممبرانِ مدرسہ کے ذمہ فرض ہے یا نہیں؟

نمبر۱۰۔ جو طلبا انگریزی خواں ہیں، ان کے لیے شرعاً یہ ضروری ہے کہ وہ علم دین کی تکمیل میں مشغول ہوں، تاکہ فارغ التحصیل ہوکر دوسروں کو تعلیم دیتے رہیں۔ یا ایسے طلبا کو اس وقت (تحریکِ) ترکِ موالات و (تحریکِ) خلافت کو کامیاب بنانا ضروری ہے۔ خلاصہ سوال یہ ہے کہ تکمیل علومِ دینیہ کو ترجیح ہے یا ترکِ موالات و خلافت کے کام میں مشغول ہونے کو؟ بیّنوا و توجروا! (سوالات طلبا مدرسۃ العلوم علی گڑھ

محررہ: غرّہ (یکم) ماہِ صفر ۱۳۳۹ھ/ 13/ اکتوبر 1920ء)

(ان سوالات کا تحقیقی) الجواب

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم o

الحمد للّٰہ و سلام علیٰ عبادہِ الّذین اصطفیٰ!

دِل ہی تو ہے ، نہ سنگ و خِشت ، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار ، کوئی ہمیں ستائے کیوں (11)

ان مسائل کا جواب سننے سے پہلے (درجِ ذیل اُمور) نہایت ضروری ہے کہ:

(الف: اپنے ایمان کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجیے)

ایک مسلم صادق تمام گرد و پیش کے خیالات سے علاحدہ ہوکر اپنے ایمان کی قدر و قیمت اور شعائرِ الٰہیہ کی عظمت اور مقاماتِ مقدسہ کے تقدس و احترام کو اچھی طرح دل نشیں کرے۔

(ب: جزیرۃ العرب کے خلاف سامراجی سازشیں سمجھئے)

اور دروسِ ماضیہ (ماضی میں حاصل کیے ہوئے سبق) کے ساتھ واقعاتِ حاضرہ پر ایک گہری نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہوگا کہ آج مسلمانوں کی سب سے بڑی متاعِ گراں مایہ (جس کا تحفظ ہر ایمان رکھنے والے کا اوّلین فرض ہے) کس طرح لوٹی جا رہی ہے اور کن کن بدعہدیوں اور شرم ناک عیاریوں اور رُوباہ بازیوں (کمزور چال بازیوں) سے جزیرۃ العرب کے متعلق پیغمبرِ اسلامؐ (فداہُ أبی و اُمّی / میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں) کی سب سے اہم وصیت کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔

(ج: عراق و فلسطین اور شام پر ظلم)

أعـداءُ الـلّٰـه (اللہ کے دشمنوں) نے اسلام کی عزت اور شوکت کی بیخ کنی میں کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ عراق، فلسطین اور شام (کے علاقے) جن کو صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے خون کی ندیاں بہا کر فتح کیا تھا، (ایک مرتبہ) پھر کفار کی حریصانہ حوصلہ مندیوں کی جولان گاہ بن گئے۔

(د: خلافتِ اسلامیہ کی شان و شوکت کا خاتمہ کر دیا گیا)

پیراہن خلافت کی دھجیاں اُڑا دی گئیں۔ **خلیفۃُ المسلمین:**

(i) جس کی ہستی سے تمام روئے زمین کے مسلمانوں کی ہستیوں کا شیرازہ بندھتا ہے۔

www.rahmia.org

(ii) اور جو بہ حیثیت ''ظِلُّ اللّٰہ فی الأرض'' [12] (دین اسلام کی حکومت کا سربراہ زمین پر اللہ کا سایہ) ہونے کے آسمانی قانون کا رائج کرنے والا۔

(iii) اور مسلمانوں کے حقوق و مصالح کا محافظ۔

(iv) اور شعائر اللہ (دینی غلبے کی علامات) کی صیانت (حفاظت) کا ضامن۔

(v) اور کلمة اللّٰه (اللہ کے لائے ہوئے نظام) کی رفعت و سربلندی کا کفیل تھا۔

وہ بھی بے شمار دشمنوں کے نرغے میں پھنس کر بے دست و پا ہو چکا۔

(ہ: مسلمانوں پر مصیبتوں سے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو رہا ہے)

(اس دور میں مسلمانوں پر نازل ہونے والی مصیبت پر حضرت فاطمہؓ کے یہ اشعار صادق آتے ہیں، جو انھوں نے حضورؐ کے وصال پر کہے تھے) ۔

صُبّت علیّ مصائب ، لو أنّها
صُبّت علی الأیّام صِرن لیالیا [13]

(مجھ پر مصیبتوں کے اتنے پہاڑ ٹوٹے کہ اگر دنوں پر یہ مصیبتیں پڑتیں تو وہ رات بن جاتے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا (خاکم بدہن) سرنگوں ہوا جا رہا ہے۔ حضرت ابوعبیدہ، سعد بن ابی وقاص، خالد بن الولید اور ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہم کی روحیں اپنی خواب گاہوں میں بے چین ہیں۔

(و: مسلمانوں کی غفلت اور تعیش کے نتائج)

یہ سب کیوں ہے؟ اس لیے کہ مسلمانوں میں سے غیرت و حمیت مفقود ہو رہی ہے۔ جو جرأت اور دینی حرارت اُن کی میراث تھی، وہ انھوں نے غفلت اور تعیش کے نشے میں دوسروں کے حوالے کر دی ہے۔ یہی نہیں کہ اس مصیبت کے وقت ایک مسلمان نے مسلمان کی مدد نہیں کی، بلکہ قیامت تو یہ ہے کہ کفار کی موالات (دوستی) و اعانت اور وفاداری کے شوق میں ایک مسلمان نے دوسرے کی گردن کاٹی۔ بھائی نے بھائی کا خون پیا اور دشمنوں کے سامنے سرخرو ہونے کے لیے اپنے ہاتھ اپنے ہی خون میں رنگے۔

(ز: اسلامی ممالک کی آزادی کے خاتمے کا سبب؛ عرب اور ہندوستان)

اے فرزندانِ اسلام! اور اے محبانِ ملت و وطن! آپ کو مجھ سے زیادہ معلوم ہے کہ جس برقِ مسلم سوز (مسلمانوں کو جلانے والی آگ) نے ان بلادِ اسلامیہ کے خرمنِ آزادی کو جلایا اور خلافتِ اسلامیہ کے قصر کو آگ لگائی، اُس کا اصلی ہیولا (ڈھانچہ) عربوں اور ہندوستانیوں کے خونِ گرم سے تیار ہوا تھا۔ اور جس دولت سے نصاریٰ ان ممالکِ مقدسہ میں کامیاب ہوئے، اُس کا بڑا حصہ بھی تمھارے ہی دست و بازو سے کمایا ہوا تھا۔

www.rahmia.org

(ح: ظالم حکومت سے تعاون کا کوئی جواز نہیں)

پس کیا اب بھی کوئی ایسا پلید اور غبی (کم عقل) مسلمان پایا جاتا ہے، جس کو نصاریٰ کے موالات و مناصرت (تعاون اور مدد) کے نتائج قطعیہ معلوم نہ ہوتے ہوں اور ایسی تشویش ناک حالت میں جب کہ ڈوبتا ہوا آدمی ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے، وہ اس فکر میں ہو کہ کوئی صورت موالات (حکومت کے ساتھ تعاون) کے جواز کی نکالے۔

(ط: اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ)

اے میرے عزیزو! (حکومت سے عدمِ تعاون کے مسئلے میں) یہ وقت استحباب (مستحب) اور فرضیت کی بحث کا نہیں، بلکہ غیرتِ اسلامی اور حمیتِ دینی سے کام لینے کا ہے۔ کہیں علمائے زمانہ کا چھوٹا بڑا اختلاف تمھاری ہمتوں کو پست اور تمھارے ولولوں کو پژمردہ نہ کردے۔ میں اس وقت تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم تلوار لے کر جہاد کرو یا عراق و شام میں جا کر اپنے بھائیوں کا ساتھ دو، بلکہ محض اس قدر درخواست کرتا ہوں کہ تم اپنے دشمنوں کے بازوؤں کو قوی مت بناؤ۔

(ی: درجِ ذیل ارشاداتِ خداوندی پر اخلاص سے عمل کرو)

اور حق تعالیٰ شانہٗ کے (قرآن حکیم میں بیان کردہ) ان ارشادات پر نہایت مستعدی اور جواں مردی اور اخلاصِ نیت سے عمل کرو:

(ا۔ یہود و نصاریٰ کو اپنا دوست نہ بناؤ)

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۘ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ ۗ الآیہ[14]

(اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو اپنا دوست اور مددگار مت بناؤ۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ اور جو کوئی تم میں سے ان کو دوست اور مددگار بنائے، وہ بھی اِنھیں میں سے ہے۔)

(۲۔ مسلمانوں کو کافروں سے دوستی کا کوئی حق نہیں)

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ [15]

(مسلمانوں کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ مؤمنین کے سوا کافروں کو اپنا دوست یا مددگار بنائیں۔ اور جو ایسا کرے گا، اس کو اللہ سے کچھ سروکار نہیں۔)

(۳۔ کافروں سے دوستی میں کوئی عزت نہیں ہے)

الَّذِينَ يَتَّخِذُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۚ أَيَبْتَغُونَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَإِنَّ الْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ﴿16﴾

(سنا دو جو مؤمنین کے سوا کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں، کیا وہ اُن کے پاس عزت تلاش کرتے ہیں، حال آں کہ تمام تر عزت خدا کے لیے ہے۔)

www.rahimia.org

(۴۔ کافروں سے دوستی، اللہ کی ناراضگی کا سبب ہے)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ (17)

(اے ایمان والو! مؤمنین کے سوا کافروں کو اپنا یار و مددگار مت بناؤ۔ کیا تم لیا چاہتے ہو اپنے اوپر اللہ کا الزام صریح)

(۵: دین کا مذاق اڑانے والوں سے دوستی نہ لگاؤ)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ (18)

(اے ایمان والو! تم ان اہل کتاب اور کافروں کو اپنا یار و مددگار مت بناؤ، جنھوں نے بنا لیا ہے تمھارے دین کو ہنسی اور کھیل اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مؤمن ہو۔)

(۶۔ کافروں سے دوستی کرنے والے اللہ کے غضب کے سزاوار ہیں)

تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ وَلَوْ كَانُوْا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوْهُمْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ (19)

(ان میں سے بہت سے تم ایسے دیکھو گے جو رفیق بنتے ہیں کافروں کے۔ بے شک بُرا ہے وہ جو آگے بھیجا ہے انھوں نے خود اپنے لیے، کہ اللہ کا غضب ہے اُن پر، اور وہ ہمیشہ عذاب میں ہیں۔ اور اگر یقین رکھتے ہیں وہ اللہ پر اور نبیؐ پر اور اس پر جو نبیؐ کی طرف اُتارا گیا تو کافروں کو رفیق نہ بناتے، لیکن اُن میں بہت سے نافرمان ہیں۔)

(۷: صحابہؓ کی طرح اپنے اندر ایمان کی پختگی پیدا کرو)

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَاۗدُّوْنَ مَنْ حَاۗدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَاۗءَهُمْ اَوْ اَبْنَاۗءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (20)

(نہیں پاؤ گے تم کسی قوم کو جو یقین رکھتی ہو اللہ پر اور قیامت کے دن پر کہ وہ دوستی کرے اُن سے جنھوں نے مقابلہ کیا اللہ کا اور اُس کے رسولؐ کا، اگرچہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ ایسے ہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت کر دیا اور اپنی روح سے اُن کی مدد فرمائی۔ اور ان کو داخل کرے گا باغ بہشت میں، جس کے نیچے بہتی ہیں نہریں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ اُن سے خوش اور وہ اللہ سے خوش۔ یہ جماعت ہے خدا کی۔ یاد رکھو کہ خدا کی جماعت ہی کامیاب ہے۔)

(۸: اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو دوست نہ بناؤ)

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَاۗءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَاۗءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ (21)

(اے ایمان والو! میرے دشمن اور اپنے دشمن کو رفیق مت بناؤ۔ پیغام بھیجتے ہو تم اُن کی طرف دوستی کا، حال آں کہ وہ

www.rahnimia.org

منکر ہوئے ہیں اُس سچائی سے، جو تمھارے پاس پہنچی ہے۔)

اس مضمون کی آیات قرآن مجید میں بہ کثرت ہیں، جن کا استیعاب (احاطہ کرنا) مقصود نہیں، مگر اس قدر واضح رہے کہ ''اَوْلِیَآءَ'' کا ترجمہ جو ہم نے ''دوست'' اور ''مددگار'' سے کیا ہے، اس کا ماخذ امام ابن جریر طبریؒ (کی تفسیر طبری ''جامع البیان عن تأویل آی القرآن'' [22]) اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ (کی تفسیر القرآن العظیم [23]) اور امام فخر الدین رازیؒ (کی التفسیر الکبیر [24]) وغیرہم اکابر مفسرین کی تصریحات ہیں۔

(طلبا کے سوالات کے جوابات)

ہماری غرض صرف اس قدر ہے کہ ترکِ موالات (عدمِ تعاون) کے تحت میں جیسا کہ اُن کی مدد کرنا داخل ہے، اسی طرح اُن سے امداد لینا بھی ہے۔ لہٰذا:

(سوال نمبر ۱ اور ۲ کا جواب)

آپ کے سوالِ اوّل و دوئم کا جواب یہ ہوگا کہ مدارس میں جو امداد گورنمنٹ سے لی جاتی ہے اور جو وظائف طلبا وغیرہم کو ملتے ہیں، وہ سب قابل ترک ہیں۔

(سوال نمبر ۳ کا جواب)

اور اس ترکِ موالات میں (عدمِ تعاون کی اس تحریک میں شرکت کے لیے) طلبا اپنے والدین کی اجازت کے محتاج نہیں ہیں، بلکہ اُن کا حق ہے کہ وہ ادب اور تہذیب کے ساتھ اپنے والدین کو بھی ترکِ موالات پر مستعد بنا لیں۔

(سوال نمبر ۴ کا جواب قرآنی آیتِ مبارکہ سے)

اس وقت جو خلجان (ذہنی خیال) بعض طلبا کو پیش آ رہا ہے، عہدِ نبوت میں بھی بعض مؤمنین کو پیش آیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ مبارک میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! کفار سے بالکل علاحدگی اور قطع تعلق کس طرح ہوسکتا ہے؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو اپنے ماں باپ اور اپنے بھائیوں اور اپنے خویش و اقارب سب سے چھوٹ جائیں گے۔ ہماری تجارتیں تباہ ہوجائیں گی۔ ہمارے اموال ضائع ہوجائیں گے۔ اور ہماری بستیاں اُجڑ جائیں گی۔

اس کا جواب حق تعالیٰ نے یہ عنایت فرمایا:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

(کہہ دو کہ تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا کنبہ اور مال جو تم نے کمایا ہے اور تجارت جس کی کساد بازاری سے تم ڈرتے ہو اور مکانات جو تم کو پسند ہیں، اگر یہ سب تم کو خدا اور خدا کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں تو منتظر رہو، تاکہ لے آئے اللہ اپنے حکم کو اور اللہ دست گیری نہیں کرتا

www.rahimia.org

اس قوم کی جو نافرمان ہے۔)[25]

(سوال نمبر ۷۔ تحریک کی ناکامی کے وسوسے کا جواب)

کبھی دل میں یہ وسوسہ گزرتا ہے کہ خدانخواستہ اگر یہ تحریکات جو ملک میں پھیل رہی ہیں، ناکام ہوئیں اور گورنمنٹ اپنی ضد پر اڑی رہی تو ہم کو سخت ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس طرح کے خیالات اُس زمانے میں بھی پیش کیے گئے تھے۔

چناں چہ قرآن مجید میں ہے کہ:

يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ؕ [26]

(ان میں کہتے ہیں کہ ہم کو ڈر ہے کہ نہ آجائے ہم پر گردش زمانے کی۔)

یعنی منافقین کہتے ہیں کہ ہمارے دوستانہ تعلقات یہود کے ساتھ اس لیے ہیں کہ زمانے کی گردش سے کہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارادے ناکام ہوں (نعوذ باللہ) اور یہود غالب آجائیں تو اس وقت ہمارے لیے بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا۔

اس کے جواب میں حق تعالیٰ شانہٗ نے فرمایا:

فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ؕ [27]

(تو قریب ہے کہ لے آئے اللہ فتح یا کوئی اور بات اپنے پاس سے۔ پھر منافقین اُن خیالات پر نادم ہوکر رہ جائیں جو اُن کے دلوں میں مکنون (چھپے) ہیں۔)

پس اے عزیزو! تم اللہ پر بھروسہ کرکے اور اُس کی رسّی کو مضبوط تھام کر اپنے عزم پر قائم رہو۔ اور موالاتِ نصاریٰ کو ترک کرو۔ اور اپنی استطاعت کے موافق جو خدمت گزاری اسلام اور اہل اسلام کی کرسکتے ہو، اُس سے درگزر نہ کرو کہ اب وقت درگزر (نظر انداز کرنے) کا نہیں۔

(سوال نمبر ۸ کا جواب)

حسنِ اتفاق سے اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی کثیر التعداد قوم (ہنود) کا مطمحِ نظر بھی تمھاری ہمدردی اور (جلیاں والا باغ امرتسر کے) واقعاتِ پنجاب[28] اور خواہشِ سیلف گورنمنٹ (خود مختار حکومت کی خواہش) کی وجہ سے **ترکِ موالات مع النّصاریٰ** (عیسائی حکومت کے ساتھ عدمِ تعاون) ہے۔ اور ابھی حال میں سنا گیا ہے کہ ''سکھ لیگ'' نے بھی یہی فیصلہ کرلیا ہے۔ اس موقع کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ تم اپنی نظر فقط خدا پر رکھو۔ تمھارا دوست اور مددگار صرف وہی ہے۔

(غیر مسلموں سے تعلقات کا قرآنی اصول)

البتہ جو قومیں تمھارے اس پاک مقصد میں خود بہ خود شریک ہوجائیں یا تمھاری تائید اور غم خواری کریں، ان سے تم بھی مصالحت اور رواداری کا برتاؤ کرو۔ اور مُبرَّۃ و إقساط (بھلائی اور منصفانہ سلوک) سے پیش آؤ! قرآن حکیم میں ہے:

لَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى

اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (29)

(اللہ ان لوگوں کے متعلق جو دین کے معاملے میں تم سے نہیں لڑے اور نہ انھوں نے تم کو تمھارے گھروں سے نکالا، اس سے منع نہیں کرتا کہ تم ان کے ساتھ بھلائی اور منصفانہ سلوک کرو۔ بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ اللہ تو ان لوگوں کی دوستی سے روکتا ہے جو تم سے دین کے معاملے میں لڑے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا۔ اور تمھارے نکالنے میں مدد دی۔ اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں، وہی ظالم ہیں۔)

(ہندو مسلم تعلقات کے دائرۂ کار کی پابندی ضروری ہے)

اس موقع پر اس قدر تنبیہ ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان کے ان تعلقات کا اثر یہ نہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اپنے کسی مذہبی حکم کو بدلیں اور شعائرِ کفر وشرک کو اختیار کرنے لگیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ''نیکی برباد، گناہ لازم'' کی مثل اپنے اوپر منطبق کریں گے۔

(سوال نمبر۱۰ کا جواب)

میری عرض یہ ہے کہ آپ ترکِ موالات پر نہایت دیانت سے عمل کریں اور خالص خدا پر اپنی نظر رکھیں۔ اور جن طلبا سے حقوقِ واجبہ فوت نہ ہوتے ہوں، وہ اس تحریک کی تبلیغ میں بھی حصہ لیں۔ بہ قدرِ ضرورت تعلیم دینی اور ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے بعد آج کل یہ مشغلہ نہایت سُودمند ہے۔

حق تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ اور جن لوگوں کے ذمے اولاد یا بیوی یا ماں باپ کے حقوق ہوں، وہ اسی حد تک اس کام میں حصہ لیں، جہاں تک اُن کی خبر گیری سے اِغماض (چشم پوشی) نہ ہو کہ وہ بھی فرض ہے۔

(سوال نمبر٦ کا جواب)

اور اگر خلافت کی امداد وحفاظت میں سعی کرنے والے کو بہ قدر اس کی ضروریات کے خلافت کمیٹی اُس چندے میں سے، جو اسی کام کے لیے کیا گیا ہو، کچھ حقّ الخِدمت (خدمت کا معاوضہ) دے، اس کا لینا جائز ہے۔

(ظالم کافر کے ساتھ دِلی دوستی حرام ہے)

الحاصل! موالاتِ کفار (ظالم کافر کے ساتھ دوستی رکھنا) حرام ہے۔ اور جہاں تک قدرت ہو، اپنے کو اور دوسروں کو موالاتِ کفار سے علاحدہ رکھنا ضروری ہے۔ اور ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنی توجہ سب طرف سے ہٹا کر اُسی ربّ العزت سے وابستہ کرے، جس کے ہاتھ میں ہر ایک شاہ وگدا کی باگ ہے (بہ قول حافظ شیرازیؒ)۔

مصلحت دید من آنست کہ یارانِ ہمہ کار
بہ گزارند و خم طرۂ یارے گیرند (30)

(میں نے جو مصلحت دیکھی، وہ یہ ہے کہ تمام کام کرنے والے دوست احباب نکلیں اور اپنے دوستوں کی دستار کے پیچ وخم اور اُن کی عزت سنبھالیں۔)

www.rahimia.org

اب بندہ التماس ختم کرتا ہے اور اس قدر اَور معروض ہے کہ بندہ کوئی مفتی نہیں۔ فتویٰ لکھنا دوسرے علما کا کام ہے۔ تاہم امید ہے کہ میری معروضات سے آپ کو اپنے سوالات کا جواب مل جائے گا۔

(سوال نمبر ۹ کا جواب)

اور علی گڑھ کالج کی عمارتوں اور کتب خانے کی حفاظت کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آپ کے دل کو دستک دے گا کہ قسطنطنیہ، شام، فلسطین اور عراق کی قیمت سے ان چیزوں کی قیمت کو کیا نسبت ہے۔

(تحریک بالکل پُرامن اور عدمِ تشدد پر مبنی ہو)

بالکل آخر میں مجھے یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ تحریک ترکِ موالات کا موجودہ حالت میں کامیاب بنانا صرف اس پر منحصر ہے کہ کوئی حرکت ہماری طرف سے ایسی نہ ہونی چاہیے، جو نقضِ امن یا سفکِ دِماء (امن کو تباہ کرنے یا خون بہانے) کو (کا) موجب (سبب) ہو۔ اور یہی نصیحت اس ملک کے تمام سربرآوردہ دانش مندوں کی ہے۔ اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لیا جائے۔ ورنہ فائدے کی جگہ نقصان کا اندیشہ ہے۔

والسلام (مؤرخہ ۱۲ر صفر ۱۳۳۹ھ/ 25ر اکتوبر 1920ء)

(بارگاہِ ربّ العزت میں دعا)

اب میری یہ اِلتجا ہے کہ آپ سب حضرات بارگاہِ ربّ العزت میں نہایت صدقِ دل سے دعا کریں کہ وہ ہماری قوم کو رُسوا نہ کرے اور ہم کو کافروں کا تختۂ مشق نہ بنائے۔ اور ہمارے اچھے کاموں میں ہماری مدد فرمائے۔

و آخر دعوانا أن الحمد لِلّٰہ ربّ العالمین

و صلّی اللّٰہ علیٰ خیر خلقہٖ محمّد و آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

آپ کا خیر اندیش

بندہ محمود عفی عنہٗ

۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

حوالہ جات وحواشی

1۔ دیوان الامام شافعیؒ، ترتیب: مولانا عبدالرشید خانپوری، ص 185، شعبہ نشر و اشاعت جامعہ علوم القرآن بھڑوچ، گجرات (انڈیا)

2۔ صحیح مسلم، کتاب الجنّة و صفة نعیمها، ج 2، ص:378۔

3۔ القرآن 214:2۔

4۔ القرآن 142:3۔

5۔ القرآن 1-3:29۔

www.rahimia.org

6۔ القرآن 110:12۔
7۔ القرآن 76:4۔
8۔ القرآن 77-78:4۔
9۔ دیوان حافظ شیرازی، غزل شمارہ نمبر 184۔
10۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے اس پیراگراف کو نقل کر کے ''نقش حیات'' میں تحریر فرماتے ہیں:
''ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تعلیم اور زبان کے متعلق جو ارشاد حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا ہے، منصف انگریز بھی یہی، بلکہ اس سے زیادہ تسلیم کرتے ہیں۔ چناں چہ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر 1871ء میں (اپنی کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' کے) صفحہ 202 میں لکھتا ہے کہ: ''مسلمانوں میں بھی عیسائیوں کی طرح وہ لوگ اقلیت میں ہیں، جو واقعی باغیرت اور خوددار ہوں۔ دنیادار لوگ ہمیشہ قائم شدہ حکومت کا ساتھ دیتے ہیں۔ ہمارے اینگلو انڈین سکولوں سے کوئی نوجوان خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، ایسا نہیں نکلتا، جو اپنے آبا وَ اجداد کے مذہب سے انکار کرنا نہ جانتا ہو۔ ایشیا کے پھلنے پھولنے والے مذاہب جب مغربی سائنس کے یخ بستہ حقائق کے مقابلے میں آتے ہیں تو سوکھ کر لکڑی ہوجاتے ہیں۔ ان بے دینوں کی بڑھتی ہوئی نسل کے علاوہ ہم کو عافیت پسند طبقے کی امداد حاصل ہے۔ یہ لوگ جو کچھ بے ضرر اعتقادات اور تھوڑی بہت جائیداد کے مالک ہیں، اپنی نمازیں ادا کرتے اور بڑے اہتمام سے مسجدوں میں جاتے ہیں، لیکن ضروری اور اہم مسائل پر سوچنے کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔'' (ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین ایم بی بی ایس، ص: 202)
(نقش حیات، ج:2، ص:260)
11۔ دیوانِ غالب (نسخۂ رَضا)، مرتبہ کالی داس، ص 437، ساکار پبلشرز، بمبئی
12۔ ''السّلطان ظل اللّٰہ فی الأرض، یأوی إلیه الضّعیف، و به ینتصر المظلوم، و من أکرم سلطان اللّٰہ عزّ و جلّ فی الدّنیا، أکرمهُ اللّٰہ یوم القیامة.'' (رواهُ البیهقی و الطّبرانی، حدیث نمبر 1663)
(مسلمانوں کی حکومت زمین میں اللہ کا سایہ ہوتی ہے۔ کمزور آدمی اس کے سائے میں پناہ لیتے ہیں اور اُسی کے ذریعے مظلوم کی مدد کی جاتی ہے۔ جو آدمی اللہ کی دنیا میں قائم کردہ حکومت کی عزت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی قیامت کے دن عزت کرے گا۔)
13۔ دیوان الامام علی، ص 215، دارالعلمیہ، بیروت
14۔ القرآن 51:5۔
15۔ القرآن 28:3۔
16۔ القرآن 139:4۔
17۔ القرآن 144:4۔
18۔ القرآن 57:5۔
19۔ القرآن 81-82:5۔
20۔ القرآن 22:58۔
21۔ القرآن 1:58۔
22۔ امام ابوجعفر طبریؒ سورت النسا کی آیت نمبر 144 کی تفسیر میں لکھتے ہیں:
''قال ابو جعفر: و هٰذا نهیٌ من اللّٰہ عبادهُ المؤمنین أن یتخلّقوا بأخلاق المنافقین الّذین یتّخذون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین، فیکونوا مثلهم فی رکوب ما نهاهم عنهُ من موالاة أعدائهِ. یقول له جلّ ثنائهُ: یا أیّها الّذین آمنوا باللّٰہ و رسولهِ،

www.rahimia.org

لا توالوا الكفّار فتؤزّروهم من دون أهل ملّتكم و دينكم من المؤمنين، فتكونوا كما أوجب لهُ النّار من المنافقين.''
(تفسير الطّبری ''جامع البيان عن تأويل آی القرآن'' لابی جعفر محمّد بن جرير الطّبری، ج:4،ص: 2606،طبع: دارالسلام، قاہرہ اسکندریہ)

23۔ قال الإمام ابن كثيرؒ فی تفسيرهٖ:
''ينهی اللّٰه تعالیٰ عبادهُ المؤمنين عن اتّخاذ الكافرين أولياء من دون المؤمنين، يعنی مصاحبتهم و مصادقتهم و مناصحتهم و أسرار المودّة إليهم....'' (تفسير القرآن العظيم لابن كثيرؒ. تفسير سورت النسا، آيت 144)

24۔ قال الإمام فخر الدّين الرّازیؒ فی تفسيرهٖ الكبير: ''يقول المنافقين إنّما نخالطهم لأنّا نخشیٰ أن تصيبنا دائرة. قال الواحدی: الدّائرة من دوائر الدّهر كالدّولة، و هی الّتی تدور من قومٍ إلیٰ قومٍ، و الدّائرة هی الّتی تخشیٰ كالهزيمة و الحوادث المخوّفة، فالدّوائر تدور، و الدّوائل تدول. قال الزّجاج: أی نخشیٰ أن لا يتمّ الأمر لمحمّد صلّی اللّٰه عليه و سلّم فيدور الأمر كما كان قبل ذٰلک.''
(التّفيسر الكبير للإمام الرّازیؒ، تفسير تحت آيت 57، سورة المائدة، ج:12، ص:16، طبع: بيروت)

25۔ القرآن 24:9۔ 26۔ القرآن 52:5۔ 27۔ القرآن 52:5۔

28۔ واقعاتِ پنجاب کی تفصیل یہ ہے کہ مارچ اور اپریل 1919ء کو عدمِ تشدد کی بنیاد پر چلائی گئی تحریک ''تحریک عدمِ تعاون'' کو ناکام بنانے کے لیے پنجاب کے شہر امرتسر اور دیگر مقامات پر پنجاب کے گورنر سر مائیکل ایڈوائر نے ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ اس پر پنجاب کے لوگوں میں اس کے آمرانہ انداز کی وَجہ سے برطانوی سامراج کے خلاف خاص طور پر غصہ تھا۔ چناں چہ مہاتما گاندھی کی اپیل پر 30/ مارچ 1919ء کو امرتسر میں زبردست ہڑتال ہوئی۔ اس دن ایک بھاری جلسہ ہوا، جس میں پینتیس ہزار آدمی شریک تھے۔ مقبول عوامی رہنما ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اپنی تقریر میں عوام سے گزارش کی کہ اُن کی یہ جدوجہد بالکل پُرامن ہونی چاہیے۔ امرتسر میں یہ انگریزی سامراج کے خلاف غم و غصے کا بڑا بھرپور مظاہرہ ہو رہا تھا۔
سر مائیکل ایڈوائر کے لیے یہ صورتِ حال بڑی تکلیف دہ تھی۔ چناں چہ اُس نے مقبول رہنما ڈاکٹر ستیہ پال اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو نظر بند کر دیا۔ اس پر 6/ اپریل 1919ء کو پنجاب میں زبردست ہڑتال ہوئی اور سارا کاروبار اور کام ٹھپ ہو گیا۔ 12/ اپریل تک امرتسر، لاہور، گوجرانوالا اور قصور میں بڑے بڑے مظاہرے ہوئے۔ 13/ اپریل 1919ء کو امرتسر کے جلیاں والا باغ میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے خلاف ایک زبردست احتجاجی جلسہ منعقد کیا گیا۔ جس میں ہزاروں مردوں، عورتوں، بوڑھوں اور بچوں نے جمع ہو کر حکومت کے خلاف اظہارِ ناراضگی کیا۔ اس موقع پر برگیڈیئر جنرل ڈائر کے حکم سے مسلح فوجیوں نے جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور بغیر کسی تاخیر و اجازت کے ہزاروں نہتے افراد پر بے دریغ گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر کے خون کی گنگا جمنا بہادی۔ نہ جانے کتنے معصوم افراد نے ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اس طرح جلیاں والا باغ یادگار اور تاریخی مقام بن گیا۔ امرتسر کی گلیوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ایک ساتھ بہا۔ لاہور میں بلاتفریق مذہب وملت فوجی افسروں کو سلامی نہ دینے اور اُن کے آگے سر نہ جھکانے پر انتہائی ظالمانہ اور سفاکانہ رول ادا کیا گیا۔ (تفصیلات کے لیے دیکھئے! حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی ڈائری۔ ج:2،ص:59 تا 69، مرتبہ: ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری، طبع: مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان کراچی)

29۔ القرآن 60:9-8۔ 30۔ دیوانِ حافظ شیرازی، غزل شمارہ نمبر 185

☆

مطالعۂ سیاسیات

پاکستان میں قومیتوں کا مسئلہ اور
مولانا سندھیؒ کا نقطۂ نظر

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر مفتی سعید الرحمٰن

دنیا جو کئی براعظموں (Continents) میں تقسیم ہے اور ان میں سے ہر براعظم بے شمار اقوام وممالک میں بٹا ہوا ہے۔ دنیا اسی وقت صحیح معنوں میں اَمن وسکون کا گہوارہ ثابت ہوسکتی ہے، جب یہاں انسانوں پر ظلم و جور کا خاتمہ اور بلالحاظ رنگ ونسل و قوم و ملک اور ملت و مذہب ہر شخص آزادی اور رواداری کی فضا میں سانس لے۔ جب تک رنگ ونسل یا قوم و ملک یا ملت و مذہب کی اساس پر ظلم و انصاف کے پیمانے بنائے جاتے رہیں گے، اس وقت تک دنیا کا کوئی خطہ اپنے باشندوں کے لیے خوش حالی کا گہوارہ ثابت نہ ہوگا۔

دنیا میں اَمن و آشتی اور خوش حالی کا دور اسی وقت شروع ہوسکتا ہے، جب یہاں ایسا نظام قائم ہو جو تمام اقوام کے اجتماعی مسائل حل کرے، ان کے باہمی تنازعات کا عدل و انصاف کے حوالے سے تصفیہ کرے اور جس کی اساس اقوام و افراد کی باہمی مساوات ہو، نہ کہ طبقاتی، جغرافیائی، علاقائی اور مذہبی حدبندیاں اس میں فیصلہ کن ہوں۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کا سلسلہ

برعظیم ہند (Indian Great Continent) میں مغل دورِ حکومت کے عروج و زوال کے سنگم پر وہ شخصیت ظاہر ہوئی، جس نے آنے والے حوصلہ شکن حالات میں اسلام کو دور اَز کار رفتہ بننے سے محفوظ رکھا اور آنے والے انقلاب کے لیے فکرِ نو عطا کی، جس سے انقلابِ فرانس اور انقلابِ روس کے مفکرین بھی استفادہ کرتے نظر آتے ہیں اور حالیہ انقلابِ ایران میں تو اس فکر کی بے شمار جھلکیاں اہلِ شعور پر آشکارا ہوئیں۔ یہ شخصیت امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی ہے۔

ہمارے ملک کے اہلِ علم اس لحاظ سے بجا طور پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ ایک بے نظیر محدث، مفسر اور صوفی تھے، لیکن معاشی، معاشرتی اور سیاسی نظام کے حوالے سے ان کی شخصیت بالعموم نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔ حال آں کہ مسلم اُمہ اور خصوصاً جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے کس قدر بڑی سعادت ہے کہ دنیا میں دورِ انقلاب اور صنعتی انقلاب کے آغاز سے قبل ہی ایک عظیم ہندی شخصیت نے فکرِ انقلاب عطا کرکے دنیا کے انقلابی زعما کی قیادت کی۔

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا فکر محض اپنے دور تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس سلسلے کے مفکرین ومجاہدین کا موجودہ دور تک ایک سلسلہ ملتا ہے۔ ان میں شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، شاہ عبدالقادر دہلویؒ، شاہ محمد اسحاق دہلویؒ، شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ، سیّد احمد شہیدؒ، سید صبغت اللہؒ

پیر پگارا اوّل، حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حافظ محمد ضامن شہیدؒ، مولانا عبدالرحیم رائے پوریؒ، مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ، مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، مولانا تاج محمود امروٹیؒ، مولانا غلام محمد دین پوریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، حاجی فضلِ واحد ترنگ زئیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن رائے پوریؒ نمایاں ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ اور ان کی جماعت

اس سلسلے کی ایک عظیم شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ (متوفی 1920ء) کی ہے، جن کی آزادیٔ برعظیم کے لیے قربانیاں آج کے نوجوان سے مخفی ہیں، جب کہ آزادی کی کاوشوں میں شاید ہی کوئی ان کا ہم پلہ ہو۔ مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، ڈاکٹر مختار احمد انصاریؒ، ڈاکٹر سیف الدین کچلوؒ، حکیم محمد اجمل خاںؒ، مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسرت موہانیؒ، مولانا شوکت علیؒ، مہاتما گاندھی اور خان عبدالغفار خاںؒ جیسی قدآور شخصیتیں ان کی تربیت میں رہ کر ہی سیاسی میدان کی شہ سوار ثابت ہوئیں اور آزادی کی ہیرو قرار پائیں۔ علاوہ ازیں ان کی سیاسی بصیرت سے استفادہ کرنے والوں میں مولانا رُشداللہؒ صاحب پیر جھنڈا، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا محمد الیاس دہلویؒ، مولانا محمد صادق کراچویؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور نواب وقار الملکؒ جیسی شخصیات بھی شامل ہیں۔

حضرت شیخ الہندؒ پہلے عالمِ دین ہیں، جنھوں نے روایتی تقدس کو اس کی اپنی مخصوص شکل میں ملحوظ نہ رکھتے ہوئے علی گڑھ کے فضلا (Graduates) کو استعمار کے مقابلے پر علمائے دین کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اور قدیم و جدید کی باہمی آویزش کو انگریز سے آزادی کی جنگ میں تبدیل کر دیا۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت علی گڑھ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، جو بعد ازاں دہلی منتقل کر دی گئی۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے محض جنگِ آزادی کی صف بندی اور قیادت ہی نہیں کی، بلکہ اپنے حلقے کی آزادی کے بعد کے دور کے لیے بھی تربیت و رہنمائی کی اور نظام کے مختلف پہلوؤں پر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے افکار کی روشنی میں اذہان کو صیقل کیا۔ اس باب میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ (متوفی 1944ء) کی شخصیت اپنے استاذ سے سب سے زیادہ مستفید اور مطمئن نظر آتی ہے، جن کو یہ انفرادی امتیاز بھی حاصل ہے کہ انھوں نے حق کی خاطر اپنا موروثی مذہب ترک کیا اور اپنا موروثی وطن بھی چھوڑا۔

امامِ انقلاب حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ

مولانا عبیداللہ سندھیؒ 25 سال کی جلاوطنی کے بعد جب برعظیم ہندوستان واپس تشریف لائے تو آزادی کے بعد کے دور کے لیے نظامِ مملکت کے مختلف پہلوؤں پر فکرِ ولی اللّٰہی کی روشنی میں نہ صرف تسلسل سے اظہارِ خیال کیا، بلکہ متعدد ادارے بھی قائم کیے۔ جن میں مہا بھارت سوراجیہ پارٹی (اس کا منشور ترکی میں 1924ء میں مرتب ہوا)، جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی، جمعیت خدام الحکمت، بیت الحکمت، محمد قاسم ولی اللہ تھیالوجیکل اسکول، جمعیت الطلبا سندھ اور یادگارِ شیخ الہند وغیرہ شامل ہیں۔

امام انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ اور پاکستان

مولانا سندھیؒ نے اس خطے کو اپنے لیے نمونے کے طور پر میدانِ عمل قرار دیا، جس کے بیش تر حصے پر آج کا پاکستان مشتمل

ہے۔ انھوں نے اس علاقے کے مسائل پر اپنی رائے دی، جو موجودہ دور میں اپنی اہمیت باشعور افراد سے منوا رہی ہے۔ مولانا سندھیؒ اس خطے کو مرکزِ عمل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''ہم شمالی ہند کے رہنے والے دکن سے اس قدر آشنا نہیں، بنگال کو ہماری معلومات کی ضرورت نہیں۔.....
لیکن بدقسمت شمال مغربی ہند جس پر مصیبت سب سے زیادہ آتی ہے، اسی طرح خوابِ غفلت میں مست ہے۔ اکالیوں (سکھوں) کے سوا ملکی رہبر نوجوانوں کو سحر کی نیند سُلا رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے اس سرزمین کو سب سے پہلے اپنا قبلۂ توجہ بنایا ہے۔''(1)

اس کے علاوہ مولانا سندھیؒ مذکورہ خطے کو برعظیم میں خصوصی حیثیت کا حامل تصور کرتے تھے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

''دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیئر (موجودہ خیبر پختونخواہ) اور افغانستان وغیرہ میں جس قدر قومیں بستی ہیں، یہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرکزی جماعتیں ہیں اور یہی امامت کی حق دار ہیں۔''

آگے چل کر مولانا مزید فرماتے ہیں:

''ہندوستان میں ہم تمام ہندوستان ہندوؤں کے لیے چھوڑ سکتے ہیں، مگر اس علاقہ یعنی پنجاب، کشمیر، سندھ، فرنٹیئر، بلوچستان اور افغانستان سے ہم کبھی دست بردار نہیں ہو سکتے۔ خواہ وہ تمام دنیا کو ہمارے مقابلے پر لے آئیں۔''(2)

اس خطے (پاکستان) کو درپیش مسائل میں سے ایک مسئلہ جو اپنی جگہ حساسیت رکھتا ہے، وفاق (Federation) اور ان کی اکائیوں (Units) سے تعلق رکھتا ہے۔ اس پر گفتگو سے قبل چند امور کا پیش نظر رکھا جانا ضروری ہے۔

وطنِ عزیز پاکستان کے بنیادی مسائل

ہمارے وطن کا بنیادی اور حقیقی مسئلہ یہ ہے کہ یہاں غربت، استحصال، ظلم اور جبر و استبداد کا نظام مسلط ہے اور اس پس ماندگی اور پستی کی ذمہ داری عالمی سامراج اور اس کے کارندوں، اجارہ دار سرمایہ دار، مفاد پرست جاگیردار اور ضمیر فروش بیوروکریٹ اور سیاست دانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اس خطے کی سیاسی، معاشی اور ثقافتی آزادی اسی صورت میں ممکن ہے جب یہاں سے بیرونی دباؤ اور آلۂ کار غلبے کا خاتمہ ہوگا اور ہمارے وطن کی حقیقی ضرورت اس کی سامراجی غلبے اور سرمایہ داری نظام سے آزادی ہے۔ چناں چہ مولانا سندھیؒ کہتے ہیں:

''ہم اپنے ملک کے موجودہ نظام سرمایہ داری کو توڑ کر ایسے نظام کی بنیاد ڈالتے ہیں، جو طبقہ محنت کش یعنی ملک کی اکثریت کی فلاح کا ضامن ہو۔''(3)

اور یہ استحصالی نظام اس خطے کے تمام حصوں پر یکساں محیط ہے اور یہ حقیقت ہے کہ سامراجی گماشتے اس خطے کے مختلف علاقوں کے باہمی تعلق کو کمزور کر کے انھیں ایک دوسرے کا مدِ مقابل بنانا چاہتے ہیں۔ اس نظام کی پشت پناہی پنجاب اور خیبر پختون خوا کی شہری اور فوجی افسر شاہی نیز سندھ کے وڈیرے اور امریکا و یورپ پلٹ عنصر مساویانہ انداز میں کر رہے ہیں۔ کوئی سندھیوں کو متعصب اور ملک دشمن قرار دے کر اپنے آقاؤں کی خدمت بجا لا رہا ہے، کوئی پنجابیوں کو ظالم قرار دے کر حق نمک ادا کر رہا ہے۔ کوئی بلوچوں کو غیر ملکی ایجنٹ قرار دے کر اپنے سرپرستوں سے داد حاصل کر رہا ہے۔ کوئی پٹھانوں کو افغانوں کا حاشیہ

www.rahimia.org

بردار کہہ کر اپنی حب الوطنی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔ اور کوئی کشمیریوں کو پاکستان سے بے گانہ خودمختار کشمیر کا طعنہ دے کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے۔ آج قومیتوں پر ظلم کے ذمہ دار افراد میں انھی قومیتوں سے تعلق رکھنے والے بھی شامل ہیں۔

ہمارے وطن کا مفاد اسی میں مضمر ہے کہ یہاں کی قومیتیں ایک دوسرے کے حقوق کی پاس داری کرتے ہوئے ظالم کے مقابلے میں مظلوم کا ساتھ دیں۔ ازروئے انصاف ظالم اور مظلوم کی تقسیم ہی اصولی ہے۔ لہٰذا یہ فیصلہ کرنا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم کس صف میں کھڑا ہونا پسند کریں گے۔ کسی شخص کا قومیت کی بنیاد پر ظالم کا ساتھ دینا ہی جاہلی تعصب ہے جو کسی طور پسندیدہ نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح محض ظالم سے نفرت کرنے کی بجائے اس کی قومیت کے تمام افراد سے نفرت ظاہر کرنا' قرین انصاف نہیں۔ جب کہ مفاد پرست، خودغرض اور ستم پیشہ افراد کا درحقیقت نہ کوئی دین ہوتا ہے اور نہ قومیت و وطنیت، بلکہ ان کی برادری اپنے ہم پیشہ افراد سے ہی ترتیب پاتی ہے۔ اور اسی بنا پر قرآنِ حکیم نے ظلم پیشہ افراد پر بھی قوم کا اطلاق کیا ہے۔

علاقائی تحریکیں اور امام انقلاب کا نقطۂ نظر

آج تمدن و ثقافت اور کلچر کے تحفظ کے نام پر جو علاقائی تحریکیں سرگرم عمل ہیں۔ ان کی پشت پر اعلیٰ طبقے کے اپنے گروہی مفادات ہیں۔ اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو بقول مولانا سندھیؒ:

''ان کی اپنی پوری زندگی ان کا رہن سہن ان کی سوچ بچار اور ان کے مجلسی آداب و اطوار سب انگریزیت (یا مغربیت) میں رنگے ہوئے ہیں۔''(4)

اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

''ہمارے اوپر کے طبقے بالکل ناکارہ ہوچکے ہیں۔ ان میں اب جان نہیں رہی، ان کے نعرے، شوروغوغا اور طمطراق سارے کے سارے بناوٹی ہیں۔ یہ لوگ اندر سے بالکل کھوکھلے ہوچکے ہیں۔ ان کے جسموں میں نہ زندگی کا خون ہے، نہ ان کے تمدن میں کوئی صلاحیت اور توانائی باقی ہے اور نہ ان کے مذہب، فکر اور فلسفے میں جان ہے۔ یہ سب تباہ ہونے اور تباہ کیے جانے کے قابل ہیں۔ ان کا تمدن، ان کی تہذیب اور ان کا فکری نظام فرسودگی کے ہاتھوں دم توڑنے کو ہے۔ ان دنوں جو انھوں نے زور باندھ رکھا ہے یہ زور محض باتوں کا ہے۔ یہ تو تاریخ کا گندہ پانی ہے جو اچھل اچھل کر آسمان پر پہنچنا چاہتا ہے۔ یہ گندہ پانی لاکھ اچھلے آخر اس کی بساط ہی کیا ہے۔ سرسیّداحمد خاں اور اس کے بعد جو بھی آئے، سب نے ان طبقوں کی گرتی ہوئی عمارت کو تھامنے کی کوشش کی۔ کسی نے انگریز کا دامن پکڑا، کوئی مذہب کو امام ضامن بنا رہا ہے۔ کوئی کلچر کے نام پر اپنے آپ کو بچانا چاہتا ہے۔ لیکن یاد رکھیے یہ ساری کوششیں بے کار ثابت ہوں گی۔ اور یہ گھروندا گر کر رہے گا۔ یہ طبقے زندہ رہنے کی اپنی صلاحیتیں کھو چکے ہیں۔''(5)

مزید برآں مولانا سندھیؒ مقامی تمدنوں میں صحت مند انقلاب و تبدیلی کے خواہاں تھے، چناں چہ وہ کہتے ہیں:

''سرسیّد نے علی گڑھ کے لیے آکسفورڈ اور کیمبرج کو نمونہ بنا کر اور ایک مسلمان نوجوان کے سامنے انگریز ''جنٹلمین'' کی مثال رکھی۔ میں (اس کے برعکس) اپنے نوجوان کو یورپ کا (تربیت یافتہ) کاریگر اور (کام کی مہارت رکھنے والا) مزدور بنانا چاہتا ہوں۔ سرسیّد کی دعوت قوم کے اوپر کے طبقوں کے لیے تھی، اور میری یہ دعوت قوم کے نچلے طبقوں کے لیے ہے۔''(6)

تنگ نظر علاقائیت کی تحریکوں کے روح رواں درحقیقت اس ہمہ گیر تبدیلی کی راہ روکنا چاہتے ہیں، جو اس خطے کی ضرورت بن چکی ہے۔ کیوں کہ ہندوستان کی آزاد قومی پالیسی، وسط ایشیا، چین اور ایران و افغانستان کے حالات و انقلابات کے بعد پاکستان گردوپیش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جس طرح مغربی سامراج نے ماضی میں مذہب کے نام پر برعظیم کو تقسیم سے دوچار کیا، آج قومیت کے عنوان سے منقسم شدہ برعظیم کو مزید ٹکڑوں میں بانٹنا اس کی حکمتِ عملی کا حصہ ہے۔ اہلِ شعور اس حقیقت سے ناواقف نہیں کہ سامراج فرعون کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے مفادات' قوموں کو باہم الجھا کر اور علاقوں کو تقسیم کر کے حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل کے لیے عوام کو ایسے جذباتی نعروں کے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے کہ اہلِ بصیرت کا مؤقف دیوانے کی بڑ قرار پاتا ہے، لیکن اہلِ شعور اپنی بصیرت اور فکری تربیت کے حوالے سے قوموں کو اس سحر سے آزاد کرانے کی سعی و کاوش جاری رکھتے ہیں اور مستقبل ان کے موقف کی صداقت کا گواہ ثابت ہوتا ہے۔

ان گزارشات کے بعد وفاق سے متعلق چند لائق توجہ اُمور سپردِ قلم ہیں۔

قومیت کی بنیاد

ہمارے ملک میں 1947ء کی تقسیم سے قبل اور اس کے بعد بھی یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ قومیت کی بنیاد کیا ہے؟ مسلم لیگ کے زعما قومیت کی بنیاد مذہب کو قرار دیتے رہے ہیں، جب کہ اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے جمعیت طلبا حیدرآباد کے اجلاس منعقدہ 17/اپریل 1944ء میں اپنا مؤقف بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک قوم (Nation) سے مراد وہ سیاسی تصور ہے، جسے آج یورپ کی سیاست بھی مان رہی ہے۔ یعنی زبان کی وحدت اور تمدن و معاشرت کا یکساں ہونا، اس بنا پر وہ سندھی، پنجابی، پختون، بلوچ اور کشمیری وغیرہ اقوام کے قائل ہیں اور اس کا ذکر مہابھارت سوراجیہ پارٹی اور جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے دساتیر میں بھی کیا ہے۔ وہ ان اقوام کی اپنے علاقوں میں حکمرانی کے خواہاں تھے اور ایک قوم کے افراد کی دوسری قوم کے علاقے پر حکومت کے مخالف تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو ان کی اپنی اپنی اقوام میں سے مبعوث کیا ہے تو حکمرانوں کا ہم قوم ہونا تو ایک فطری تقاضا ہے، جب کہ حکومت' نبوت سے کم تر منصب ہے۔ لہٰذا اس فطری تقاضے کو پورا کرنا اور اس کے لیے کوشش کرنا' انسانوں کا حق ہے۔

قوم اور قومیت میں فرق

ایک لائق غور نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ مولانا سندھی نے جن گروہوں پر اقوام کا اطلاق کیا ہے، وہ درحقیقت قومیتیں ہیں۔ قوم اور قومیت میں یہ فرق تسلیم شدہ ہے کہ جس لسانی و تہذیبی گروہ کے پاس اقتدارِ اعلیٰ (Sovereignty) ہو وہ ''قوم'' (Nation) کہلاتی ہے، بہ صورتِ دیگر اُسے ''قومیت'' کہا جاتا ہے۔

مولانا سندھیؒ مندرجہ بالا گروہوں پر اقوام کے اطلاق کے باوجود ان کے علاقوں کو وفاق میں داخل قرار دیتے ہیں اور یہ بدیہی امر ہے کہ فیڈریشن (Federation) واحد اقتدارِ اعلیٰ کے حامل ملک کی ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں وہ بہار سے پشاور اور نربدا سے کشمیر تک پھیلے ہوئے رقبے میں بسنے والے گروہوں کو متعدد اقوام قرار دینے کے

باوجود اس خطے کو مذکورہ بالا خطبہ حیدرآباد میں ''قومی وطن'' قرار دیتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ ایک قومی وطن میں متعدد قومیتیں تو ہوسکتی ہیں، اقوام نہیں اور اسی نوعیت کا ان کا یہ جملہ ہے کہ:

''جب میں مسلمان نہیں تھا، میرا وطن ہندوستان تھا۔ اور اب جب میں مسلمان ہوں تو میرا وطن یہی ہندوستان ہے۔ مذہب بدلنے سے وطن نہیں بدلتا۔''(7)

مزید برآں 2/اگست 1944ء کو شہداد کوٹ کے ایک مدرسے کے افتتاح کے موقع پر مولانا ممدوح اپنے تحریری خطبہ میں بھی مندرجہ بالا مؤقف کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے نام پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ:

''نربدا، سندھ ساگر کا ذکر تو شمال مغربی ہند کی تجدید کے لیے ہے اور جمنا کے کنارے آگرہ میں اکبر اعظم اور دہلی میں شاہجہانی تحریک پھلی پھولی، وہ ہمارے ''قومی'' اساس کا سامان ہے۔''

غرض یہ کہ مولانا سندھی کے نقطۂ نظر کے مطابق ایک زبان بولنے والا گروہ جو کلچر میں ایک قسم کی یکسانیت رکھتا ہو، مستقل قومیت یا قوم ہے۔ جس رقبہ میں ایسی قومیت یا قوم بستی ہو، اسے صوبہ قرار دینا مولانا سندھیؒ کی نظر میں اس علاقے کے باشندوں کی توہین ہے، بلکہ وہ اس کو اسٹیٹ (State) قرار دیتے ہیں، چناں چہ کہتے ہیں کہ:

''اب تک جن علاقوں کو صوبہ کہا جاتا تھا، انھیں اب اسٹیٹ مانا جائے۔ اس میں نہ پارلیمنٹ کو اعتراض ہوگا نہ کانگریس کو، کیوں کہ اس میں نہ نظام میں کسی تبدیلی کی ضرورت پڑتی ہے نہ خرچ میں اضافہ ہوتا ہے۔''(8)

سٹیٹ کا ترجمہ ''ریاست'' ہی موزوں ہے جیسے "United States of America" کو اردو میں ''ریاست ہائے متحدہ امریکا'' کہا جاتا ہے۔

ہندو مسلم تنازعہ کا حل

مولانا سندھیؒ برعظیم ہند کو ہندو مسلم تنازعہ کے پس منظر میں ریاستوں میں تقسیم کرتے ہیں، چناں چہ فرماتے ہیں:

''ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کی بار بار کوششیں کی گئیں، مگر ان میں سے کوئی بھی بارآور نہیں ہوسکی۔ کیوں کہ مسئلے کی اصلیت و ماہیت پر غور نہیں کیا جاتا۔ ..... ہم ہندوستان کو ایسے ممالک میں تقسیم کرتے ہیں جہاں ایک قوم آباد ہو، جس کی زبان اور معاشرت میں یکسانیت پائی جاتی ہو، اس تقسیم کے بعد ہر ایک مذہب کے لیے کسی نہ کسی ملک (State) میں اکثریت حاصل ہونے کی گنجائش ہے۔ اس طرح مذہبی تنازعات کا قطعی طور پر سدباب ہوسکتا ہے۔''(9)

وفاق کے قیام کی اہمیت

مولانا سندھیؒ ان ریاستوں (States) پر مشتمل وفاق (Federation) کے قائل تھے۔ اور ان کے نزدیک اس وفاق میں ہر ریاست کو اس کے تناسب آبادی، اقتصادی، تمدنی اور فوجی اہمیت کے لحاظ سے حق نمائندگی حاصل ہوگا۔(10)

''اس وفاق کے پاس معاملات خارجہ (Foreign Affairs)، دفاع (Defence)، بیرونی تجارت (External Trade) ہوں گے۔''(11)

معروضی حالات کے مطابق خطے کے مفاد میں باہمی اتفاق سے وفاق کو مزید معاملات سونپے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ حقیقی مسئلہ

www.rahimia.org

یہ ہے کہ ہر علاقے کی اکثریت کی رائے کو اس کے علاقے میں اہمیت دی جائے اور وہاں کے باشندوں کو اپنے علاقے کے قدرتی وسائل سے ترجیحی طور پر استفادے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

اس خطے کا وسط ایشیا سے تعلق

مولانا سندھیؒ انڈین فیڈریشن کے قائل ہونے کے ساتھ شمال مغربی ہند (موجودہ پاکستان) اور افغانستان کی خصوصی حیثیت کے بھی علم بردار ہیں اور اس کے آگے وہ حنفی فقہ کے اشتراک کے سبب مسلم ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکستان (وسط ایشیا) کے اتحاد کے خواہاں تھے۔ (12) مزید برآں ان کی یہ رائے بھی تھی کہ:

''غلامی کے ساٹھ سال میں جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے، اگر وہ تمام کا تمام دے دیا جائے اور ننگے بھوکے رہ کر شمالی مغربی دروں سے قطب شمالی تک بسنے والی قوموں کی دوستی خرید لی جائے تو یہ خسارے کا سودا نہیں ہوگا۔'' (13)

تمدنی گروہوں کا مستقبل

آج کے پاکستان میں لسانی اور تمدنی گروہ محض سندھی، بلوچی، پنجابی، پختون اور کشمیری نہیں بلکہ بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو سرائیکی، پوٹھوہاری، اردو، ہندکو، براہی، بلتی وغیرہ وغیرہ بولنے والے گروہ بھی ہیں۔ تاہم انھیں مستقل یا ذیلی قومیت قرار دیا جانا اور اس بنیاد پر ان میں سے کسی کا ملک کے اندر اپنی ریاست کے قیام کا فیصلہ معروضی حالت کے تابع ہے۔ جیسا کہ سوویت یونین میں بشیکریوں کے لیے تاتاریوں سے الگ خودمختار جمہوریہ کے قیام کا فیصلہ معروضی حالات کی بنیاد پر کیا گیا۔ حال آں کہ بشیکری بھی ترک تھے اور وہ وولگا یورال کے تاتاریوں سے نسلی اعتبار سے بہت قریب تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ تاتاری زمینوں پر آباد تھے اور کاشت کار تھے۔ اس کے برعکس بشیکری نیم خانہ بدوش تھے۔ ہر دو میں اختلاف سماجی اور ثقافتی بنیادوں پر تھا، یعنی کسانوں اور خانہ بدوشوں کا فطری اختلاف کہ قدرے ترقی یافتہ تاتاری، بشیکریوں کو اپنا ہی خانہ بدوش اور پس ماندہ قبیلہ سمجھتے تھے۔ ان کا یہ رویہ بشیکری سیاست دانوں اور سرداروں کو ناپسند تھا۔ چناں چہ اسی اختلاف کے مدِنظر 1918ء میں ایک کروڑ بشیکریوں کی الگ خودمختار جمہوریہ وجود میں آ گئی۔ (14)

مزید برآں کہ مولانا سندھیؒ نے سرائیکی اور پوٹھوہاری بولنے والے خطوں کو بھی (States) قرار دیا ہے۔ علاوہ ازیں اس بابت جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے دستور کی دفعہ نمبر 28 یوں ہے:

''اگر کسی سوراجیہ جمہوریہ (مولانا سندھیؒ ہر سٹیٹ کو اس نام سے عوامی جمہوریت کے معنی میں موسوم کرتے ہیں) میں ایک اہم اقلیت آباد ہے، جو اپنی علاحدہ قومیت قائم رکھنا ضروری سمجھتی ہے تو ''مہابھارت سوراجیہ مرکزی کمیٹی'' اس اقلیت کو اپنی علاحدہ جمہوریہ بنانے کا اختیار دے سکتی ہے۔ اس صورت میں اس جمہوریہ کو اس قوم کی اصلی آبادی سے زیادہ اس قدر علاقہ ضرور دیا جائے گا، جس سے وہ اقتصادی اور تمدنی ضرورتوں کی حفاظت کر سکے۔''

''اس کے علاوہ جس سٹیٹ میں جو اشخاص مستقل طور پر مقیم ہو جائیں گے وہ اس کے باشندے شمار ہوں گے۔ اور وہاں قدامت اور نسل، تفوق و برتری کا ذریعہ نہیں ہوگی۔'' (15)

www.rahimia.org

قوم کے لفظ کا وسیع تر استعمال

قوم کی مندرجہ بالا واضح تعریف کے باوجود مولانا سندھیؒ لفظ ''قوم'' کے اطلاق میں نام نہاد قوم پرستوں کی مانند حد سے زیادہ حساس نہیں، بلکہ اس میں وہ توسیع برتتے ہیں۔ وہ ایک مقام پر تمام مسلمانانِ ہند کی تحریک کو ''قومی تحریک'' قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

''اگر مسلمانانِ ہند اپنا تعلق حکیم الہند امام ولی اللہ دہلویؒ کے مجددانہ پروگرام سے قائم نہ کرلیں گے تو ان کی قومی تحریک اپنی تاریخی عظمت کھو بیٹھے گی۔''(16)

ایک اور جگہ وہ پورے ہندوستانی فکر کو ''قومی فکر'' قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ کہتے ہیں:

''جس طرح ہندوستانی قومی فکر میں ہم ''ولی اللّٰہی فلاسفی'' کو مرکزی درجہ دینا چاہتے ہیں۔''(17)

اسی طرح وہ ایک گفتگو میں قوم کے بارے میں وسعت اطلاق سے کام لیتے ہیں۔ چناں چہ پروفیسر محمد سرور مرحوم لکھتے ہیں کہ:

''مولانا سندھیؒ نے راقم السطور کو بتایا کہ جب میں ابوالکلام آزاد سے ملا تو میں نے ان سے کہا کہ میں بادشاہوں سے ملا ہوں۔ بڑی بڑی سلطنتوں کے وزرا سے ملا ہوں لیکن مجھے فخر ہے کہ آج میں اپنی قوم کے سردار سے مل رہا ہوں۔ قوم کی سرداری سے مراد اُن کا کانگریس کا صدر ہونا تھا۔''(18)

سورۂ فتح کی تفسیر (قرآنی عنوانِ انقلاب) میں آیت ''قَوْمٍ أُولِي بَأْسٍ شَدِيدٍ''(19) (جنگجو قوم) سے مراد وہ قیصر و کسری کی بادشاہتیں لیتے ہیں، حال آں کہ ان کی بادشاہتوں میں مختلف اقوام بستی تھیں۔

اس کے علاوہ قرآنِ حکیم میں ظالموں اور فاسقوں پر ''قوم'' کا اطلاق کیا گیا حال آں کہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام ظالم اور فاسق وحدت زبان اور تمدن و معاشرت میں یکسانیت کے حامل ہوں کہ ان پر قوم کا اطلاق کیا جائے، بلکہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ہم نظریہ اور یکساں مفادات کے حامل گروہ کو بھی ''قوم'' کہا جاتا ہے۔

الحاصل قوم کی مقررہ تعریف کے علاوہ اس کا اطلاق عمومی معنوں میں ہوتا رہتا ہے۔ تاہم عمومی معنوں کے حوالے سے قومیتوں کے تشخص کا انکار بھی مناسب نہیں کہ از روئے قرآنِ حکیم بھی قوموں اور قبائل کی انفرادیت مسلم ہے۔ اس سلسلے میں مولانا سندھیؒ کا کہنا یہ ہے کہ:

''قومی رجحانات و خصوصیات کا انکار فطرت کا انکار ہے اور جو نظام اس قدرتی جذبے کا خیال نہیں رکھتا وہ کبھی دیرپا ثابت نہیں ہوتا۔''(20)

صحت مند قومیت کی بنیاد

اس واضح مؤقف کے باوجود مولانا سندھیؒ صحت مند قومیت کے قائل تھے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

''آج اس زمانے میں قومی مقاصد و مفادات میں صحیح راہِ عمل متعین کرنے کے لیے بین الاقوامی حالات و ضروریات کو لازماً سامنے رکھنا پڑتا ہے اور صحت مند قومیت، بین الاقوامیت کے بغیر ممکن نہیں۔''(21)

اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ مولانا سندھیؒ مسئلہ قومیت کو بین الاقوامی پس منظر میں دیکھتے ہیں اور اس حوالے سے

www.rahnia.org

صحیح راہِ عمل متعین کرنے پر زور دیتے ہیں۔

دراصل بین الاقوامی مدوجزر سامنے رکھ کر ہی کوئی قومیت اپنے لیے بہتر پیش بندی کرسکتی ہے جو قومیت یا قوم عالمی سطح پر سامراج کے استحصالی مفادات کا شعوری ادراک کرکے اس کے طے شدہ منصوبوں کے برعکس اپنے مسائل کے حل کی سعی و کاوش کرے گی، وہ صحت مند قومیت کہلائے گی اور وہ دشمنوں کا آلہ کار بننے سے محفوظ رہے گی۔ جو قومیت یا قوم اپنے گردوپیش سے بے نیاز اور عالمی سامراجی منصوبوں اور مفادات کا شعور حاصل کیے بغیر ہیجان انگیز راہِ عمل اختیار کرے گی وہ درحقیقت فسادزدہ اور بیمار قومیت ہوگی، جو عالمی سامراج کے جراثیم کا شکار ہوکر غلامی کا نیا طوق گلے میں ڈال سکتی ہے۔

قومیت کے مسئلہ کی حساسیت

پاکستان کی مختلف قومیتیں اس مسئلہ پر کافی حساس ہیں کہ ان کے علاقوں میں دیگر ہم وطن قومیتوں کے افراد روزگار کی خاطر بڑی تعداد میں آرہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ نظام کی معاشی پالیسیاں اس انداز سے ترتیب دی جاتی ہیں کہ غریب عوام اپنے روزگار کی خاطر اپنی آبائی سرزمین ترک کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں یا کردیے جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں قومیتوں کے افراد میں جو رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، اس سے غلط منصوبہ بندی کرنے والی طاقتیں محفوظ ہوجاتی ہیں۔ اور باہمی سرپھٹول سے قومیتوں پر محیط سیاہ نظام کی عمر میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے۔

اس لیے دیگر علاقوں سے مستقل طور پر آنے والے افراد مقامی مفادات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرکے ان کے حصول کی جدوجہد کرنے اور فطری طریقے سے تدریجی طور پر مقامی تہذیب اختیار کرنے، نیز مقامی قومیتوں کو ان آنے والوں کا مشترکہ مفادات کے لیے تعاون حاصل کرنے کی سبیل پیدا کرنی چاہیے۔ جب کہ دیگر علاقوں سے افراد کی کثیر تعداد میں آمدورفت اس وقت تک نہیں روکی جاسکتی، جب تک کہ ہر علاقے میں وہاں کی ضرورت کے مطابق معقول روزگار فراہم کرنے کے انتظامات نہ کرلیے جائیں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ نظام ایسے باشعور منظّم اداروں کے ہاتھ میں آجائے، جو یہاں کے عوام کے مفادات کی بالادستی کے قیام اور مفاد پرست عناصر کی پالیسیوں کے خلاف مصروف عمل ہوں۔ اس کے لیے ہم وطن قومیتوں کے مستضعفین (کمزور لوگوں) کا باہمی اتحاد وارتباط ضروری ہے اور اپنی ہم قومیت اور دوسری قومیتوں کے مستکبرین (بالادست طبقوں) کے خلاف جدوجہد لازمی ہے۔

یہ خیال درست نہیں کہ ہر مسلمان گروہ کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے دیگر ہم مذہبوں کے علاقے کے اقتصادی فوائد سے ترجیحاً مستفید ہو۔ کیوں کہ علاقائی مفادات سب سے پہلے مقامی افراد کے لیے ہوتے ہیں، فاضل ہونے یا پڑوسی علاقوں کے زیادہ ضرورت مند ہونے کی صورت میں ان کو منتقل کیے جاسکتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ:

''جس شہر کے مال داروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے اسی شہر کے مستحقین میں تقسیم کردی جائے۔''(22)

خلاصہ کلام

پاکستان کی قومیتوں کے مسائل تنگ نظر قوم پرستانہ نظریات کے فروغ سے حل نہیں ہوسکتے ہیں۔ اور نہ ہی قومیتوں کے حقوق

کا انکار درست ہے۔ اس میں اعتدال کی راہ ہی سب سے زیادہ مناسب اور محفوظ راہ ہے کہ اس خطے کو کثیر قومیتی سرزمین قرار دیا جائے۔ تاہم قوموں کے مستقل وجود کو تسلیم کرنے کا یہ مفہوم نہیں کہ یہ قومیں آپس میں مل ہی نہ سکیں اور یہ خطہ ماضی کی ریاست ہائے بلقان کی مانند باہمی نزاع کا میدان بن جائے۔

درحقیقت اس خطے کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کرنا ایک غیر معقول امر ہے۔ یہاں کی اقوام فطری طور پر مجبور ہیں کہ باہم مل جل کر رہنے کے لیے ایک وسیع سیاسی وحدت بنائیں۔ اس وحدت کے بغیر یہاں کے مسئلے کا کوئی اور حل ممکن نہیں۔ لیکن یہ بڑی اور وسیع وحدت چھوٹی چھوٹی وحدتوں کے مجموعے سے بنے۔ ہر چھوٹی وحدت اپنے دائرے میں آزاد اور خودمختار ہو اور بڑی وحدت ان آزاد اور خودمختار وحدتوں کو ایک رابطے میں پرو دے۔ یہ نہ ہو کہ چھوٹی وحدتوں کو مٹا کر ایک بڑی وحدت معرض وجود میں آئے، جیسا کہ ماضی میں مغربی پاکستان کو ایک وحدت (One Unit) بنا دیا گیا تھا۔ ایسا نہ ممکن ہے نہ فائدہ بخش۔ استعارے کی زبان میں یوں کہہ لیجیے کہ یہ سرزمین اور خطہ ایک گلدستہ ہے، جس میں ہر رنگ اور ہر نوع کے پھول ہیں۔ گلدستے کی خوبی اور حسن یہ ہے کہ ہر پھول الگ الگ اپنی بہار دکھائے اور پھولوں کی خوش نمائی اور شان اس میں ہے کہ وہ ایک رشتے میں منسلک ہو کر گلدستہ بن جائیں۔

حوالہ جات

1۔ خطبات و مقالات، ص 139، طبع رحیمیہ مطبوعات، لاہور
2۔ المقام المحمود (آخری پارہ)، از مولانا عبیداللہ سندھیؒ، تفسیر سورۃ القدر، طبع: مکی دارالکتب، لاہور
3۔ ایضاً، ص 141
4۔ افادات و ملفوظات، حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ، مرتبہ: پروفیسر محمد سرور، ص 30-429، طبع: سندھ ساگر اکادمی، لاہور، اکتوبر 1996ء
5۔ ایضاً، ص 222۔
6۔ ایضاً، ص، 510۔
7۔ ایضاً، ص، 132۔
8۔ خطبات و مقالات، ص، 349۔
9۔ ایضاً، ص، 139، 140۔
10۔ ایضاً، ص، 160۔
11۔ حالاتِ زندگی، تعلیمات و سیاسی افکار، ص، 441
12۔ المقام المحمود (آخری پارہ)، تفسیر سورۃ القدر۔
13۔ خطبات و مقالات، ص، 143۔
14۔ افادات و ملفوظات، ص، 250
15۔ خطبات و مقالات، ص، 172 و 296۔
16۔ خطبات و مقالات، ص 378۔
17۔ ایضاً، ص 354۔
18۔ افادات و ملفوظات، ص، 310
19۔ القرآن 18:48۔
20۔ ایضاً، ص 471۔
21۔ ایضاً، ص، 306
22۔ صحیح بخاری، حدیث 1395۔

☆

www.rahimia.org

مطالعۂ تاریخ

خلافتِ راشدہ کے دور میں
سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کا جائزہ

تحریر: مولانا مفتی محمد مختار حسن

دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات بیان کرتا ہے۔ دینِ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تمام انسانوں کو دنیا اور آخرت میں کامیاب بنانے کے لیے بین الاقوامی نظام قائم کرتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے خلیفۃ اللہ فی الارض بن کر دنیا میں دین کا بین الاقوامی نظام قائم کیا اور آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدینؓ نے آپؐ کی نیابت میں اس بین الاقوامی نظام کو دنیا کے دور دراز علاقوں تک پھیلانے کے لیے عظیم ترین جدوجہد اور کوشش کی ہے۔ اسے خلافتِ راشدہ کہا جاتا ہے۔ خلافتِ راشدہ کے دور کے سیاسی، معاشی اور سماجی پہلوؤں کا جائزہ لینا اور ان کی قرار واقعی حیثیت سے باخبر ہونا دورِ حاضر کی بڑی ضرورت ہے۔ اس تناظر میں یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ خلافتِ راشدہ کی حقیقی نوعیت اور اس سے متعلق امور کا مطالعہ کیا جائے۔

خلافت کا مفہوم

''خلافت'' عربی کا مصدر ہے۔ اس کا مادہ ''خلف'' اور اسی سے ''خلیفہ'' ہے۔ خلافت کے لغوی معنی نیابت اور قائم مقام کے ہیں۔ امام راغب کے نزدیک یہ نیابت کسی غیر حاضری کی وَجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ موت کے سبب سے اور عجز و معذوری کے سبب سے بھی ہوسکتی ہے۔ اس کا سبب محض نائب کو شرف بخشنے کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔ [1] قرآن کی زبان میں خلافت اور ''استخلاف فی الارض'' [2] اور وراثت و تمکین فی الارض'' [3] سے مقصود زمین کی قومی عظمت و ریاست اور قوموں اور ملکوں کی حکومت و سلطنت ہے۔ [4]

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ خلیفہ کو بین الاقوامی حکمران کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ اسی حوالے سے وہ فرماتے ہیں:

''خلیفہ سے میری مراد یہ ہے کہ جسے ایسی شان و شوکت حاصل ہو کہ جس کی طاقت اور قوت کو دوسرا حکمران چھین نہ سکے۔ سوائے اس کے کہ بہت بڑی فوجی قوت و طاقت جمع کر لی جائے اور بے تحاشہ دولت صَرف کی جائے اور بہت طویل عرصے تک اس کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ ...... کہیں جا کر اس کا مقابلہ ممکن نہ ہو۔'' [5]

بین الاقوامی خلافت کی تعریف

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بین الاقوامی خلافت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

''وهي الرّياسة العامّة في التّصدّى لإقامة الدّين، بإحياء العلوم الدّينية، و إقامة أركان الإسلام، و القيام بالجهاد، و ما يتعلق به من ترتيب الجيوش، و الفرض للمقاتلة، و إعطاء هم من الفيء، و

القیام بالقضاء، و إقامة الحدود، و دفع المظالم، و الأمر بالمعروف، و النّهی عن المنکر، نیابةً من النّبیّ صلّی اللّٰه علیه و سلّم.'' (6)

(خلافت ایسی بین الاقوامی حکومت کو کہتے ہیں، جو نبی اکرمؐ کی نیابت میں درجِ ذیل امور کے ذریعے دین کا نظام قائم کرنے کے لیے ہر طرح کی جدوجہد اور کوشش کرے:

(الف) دینی علوم کے فروغ کا نظام قائم کرنا۔ (ب) ارکانِ اسلام (نماز، روزہ وغیرہ) کا نظام قائم کرنا۔

(ج) جہاد اور اس سے متعلق درجِ ذیل امور کا نظام قائم کرنا:

(۱) لشکروں کی ترتیب و تنظیم (۲) لڑنے والے سپاہیوں کے لیے تنخواہوں کا تعین

(۳) قومی خزانے اور مالِ فئے میں سے تنخواہوں کی ادائیگی

(د) عدلیہ کا نظام قائم کرنا، اور (عدالتی فیصلوں کے مطابق) مجرموں پر حدود قائم کرنا، اور ظلم کا خاتمہ کرنا۔

(ہ) امر بالمعروف (مسلمہ نیکیوں پر عمل کرنے) اور نہی عن المنکر؛ (تسلیم شدہ بُرائیوں سے روکنے) کا نظام بنانا۔)

اس تعریف کی تشریح کرتے ہوئے امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ لکھتے ہیں:

''تفصیل ایں تعریف آں کہ معلوم بالقطع است از ملتِ محمدیہ — **علٰی صاحبها الصّلوٰة و التّسلیمات** — کہ آں حضرت ﷺ چوں مبعوث شدند برائے کافۂ خلق اللہ بہ ایشاں معاملہ ہا کردند، و تصرف ہا نمودند، و برائے ہر معاملہ نوّاب تعیین فرمودند، و اہتمامِ عظیم در ہر معاملہ مبذول داشتند۔

چوں آں معاملات استقرا نمائیم و از جزئیات بہ کلیات و از کلیات بہ کلیٔ واحد کہ شامل ہمہ باشد انتقال کنیم، جنسِ اعلیٰ آں اقامتِ دین باشند کہ متضمن جمیع کلیات است۔ و تحتِ وے اجناسِ دیگر باشند۔''(7)

(اس تعریف کی تفصیل سے ملتِ محمدیہ کے بارے میں قطعی طور پر یہ معلوم ہوا کہ چوں کہ آں حضرت ﷺ اللہ کی تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے آپؐ نے ان کے ساتھ بہت سے معاملات فرمائے۔ اور بہت سے احکامات جاری فرمائے اور ہر ایک معاملے کو سرانجام دینے کے لیے اپنے نائبین مقرر فرمائے۔ اور ہر ایک معاملے کو بڑے اہتمام سے کرنے کے لیے اپنی توجہ مبذول فرمائی۔

حضورؐ کے کیے ہوئے تمام معاملات اور فیصلوں پر جب ہم غور کرتے ہیں اور اُن کی جزئیات سے کلی قواعد وضوابط کی طرف جائیں اور اُن کلیات سے ایک ایسے کلی قاعدے اور اصول کو متعین کرنا چاہیں جو آپؐ کے تمام کیے ہوئے معاملات اور فیصلوں پر شامل ہو تو وہ قاعدۂ کلیہ دین کے نظام کو غالب کرنا ہے۔ اس قاعدۂ کلیہ کے ضمن میں دین کی تمام کلیات آجاتی ہیں اور اس کے تحت تمام جزئیات اور دیگر ذیلی اجناس آجاتی ہیں۔)

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خلافت کی دو اقسام بیان کی ہیں: 1۔ خلافتِ باطنہ 2۔ خلافتِ ظاہرہ

خلافتِ باطنہ کی تعریف

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ خلافتِ باطنہ کی تعریف ان الفاظ کے ساتھ فرماتے ہیں:

"المعتنين بتعلّم الشّرائع، و القرآن، و السّنن، و الآمرين بالمعروف، و النّاهين عن المنكر، و الّذين يحصل بكلامهم نصرة الدّين، امّا بالمجادلة كالمتكلّمين، أو بالموعظة كخطباء الإسلام، أو بصحبتهم كمشائخ الصّوفية الّذين يقيمون الصّلوٰة و الحجّ، و الّذين يدلّون علىٰ طريق اكتساب الإحسان، و المرغبون فى التّنسّک و التّزهّد، و القائمون بهدا ..... الّذين نسمّيهم بالخلفاء السّلاطين." (8)

(جو قرآن وسنت اور شریعت کی تعلیم کی طرف متوجہ ہونے والے ہوں اور بھلائی کا حکم قائم کرنے والے اور بُرائی کو روکنے والے ہوں۔ وہ ایسے لوگ ہوں کہ جن کی گفتگو سے دین کا غلبہ ہوتا ہو، خواہ مباحثے کے ذریعے جیسے متکلمین، یا وعظ ونصیحت کے ذریعے، جیسے خطبائے اسلام ہیں، یا ان کی محبت اور توجہ سے دین کا غلبہ ہو، جیسے مشائخ صوفیا جو نماز اور حج قائم کرتے ہیں اور احسان کے طریق کار کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور جو زہد اور پرہیزگاری میں رغبت رکھتے ہیں۔ اور جو ان تمام امور کو سرانجام دیتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جنھیں ہم خلفائے باطن کہتے ہیں۔) (9)

خلافتِ ظاہرہ کی اقسام

پھر خلافت ظاہرہ کی بھی دو اقسام بتلائی ہیں: 1۔ خلافتِ خاصہ 2۔ خلافتِ عامہ

ان دونوں قسم کی خلافتوں میں خلافت کی درجِ بالا صفات کامل طور پر پائی جاتی ہیں، البتہ خلافتِ خاصہ اور خلافتِ عامہ میں فرق یہ ہے کہ خلافتِ خاصہ (راشدہ/ کاملہ) وہی ہے، جس میں عوام الناس خلیفہ کے علم وعدل پر رسول اللہؐ کی حدیثِ مستفیض اور اشارات کے ذریعے اعتماد رکھتے ہوں۔ اور اگر خلیفہ کے علم وعدل پر اعتقاد صرف عمومی رائے سے ہو اور اس کے بارے میں کوئی حدیث مستفیض اور شارعؑ کے اشارات نہ ہوں، خلافتِ عامہ کہلاتی ہے۔

خلیفۂ راشد کی خصوصیات ولوازمات

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م 1762ء) نے خلافتِ راشدہ کی درجِ ذیل خصوصیات ولوازمات تحریر کی ہیں:

1۔ اوّلین مہاجرین صحابہؓ میں سے وہ صحابہ کرامؓ جو آپؐ کے ساتھ اہم مواقع جیسے غزوۂ بدر و تبوک، حدیبیہ اور دیگر میں شریک رہے ہوں۔

2۔ اُمت کے اعلیٰ ترین طبقے میں سے ہونے کے ساتھ ساتھ رسول اللہؐ سے جنت میں جانے کی بشارت پا چکے ہوں۔

3۔ رسول اللہؐ نے ان کے ساتھ ولی عہد کا سا برتاؤ کیا ہو۔

4۔ حضورؐ ان کو اپنی نگرانی میں اجتماعی امور تفویض کر چکے ہوں، جس میں صحابہؓ پر آپؐ کا اتباع کرنا واجب اور ضروری ہو۔

5۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپؐ سے کیے گئے وعدوں میں سے بعض وعدے ان کے ہاتھ پر پورے ہوں۔

6۔ اپنے دور کے تمام لوگوں سے افضل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا قول حجت قرار پایا ہو۔ (10)

خلافتِ راشدہ کی اہمیت

خلافتِ راشدہ کا دور اسلام کی حکومت کے نمونے کا دور ہے اور یہ رسول اللہؐ کی صحبت وتربیت سے پیدا ہوا۔ یہ اصولِ دین میں سے ایک اصول ہے۔ جب تک ہم اس کو مضبوطی سے نہیں تھامیں گے، اس وقت تک مسائلِ دینیہ کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس لیے

www.rahimia.org

کہ سلف صالحین نے شریعت، طریقت اور سیاست میں خلفائے راشدینؓ ہی کی تقلید کی ہے۔[11]

خلافتِ راشدہ کا دور

خلافتِ راشدہ کا دور چار خلفا؛ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی المرتضیٰؓ پر مشتمل ہے۔[12] اس دور میں اسلام کے نظام کی ایسی مضبوط اور مستحکم بنیادیں رکھی گئی ہیں، جن سے دنیا بھر میں گیارہ سو سال تک قرآن حکیم، دین اور عدلِ اجتماعی کی حاکمیت قائم رہی ہے۔ اس لیے اس دور کو نمونے کا دور قرار دیا جاتا ہے۔ گویا نمونے کا دور وہ ہوتا ہے، جو ہر حوالے سے کامل اور مکمل ہو۔

حدیث ''خیر القرون'' کا مفہوم اور امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ حضور اکرمؐ کی اس حدیث: ''خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يلُونَهُمْ.''[13] (بہترین زمانہ میرا ہے اور پھر جو زمانہ اس کے ساتھ ملے اور پھر جو ان کے ساتھ ملے۔) کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ دور اس وقت تک رہا جب تک جماعت متفقہ طور پر فیصلے کرتی رہی۔ اس دور میں جماعتِ صحابہؓ میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ دور حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی شہادت تک رہا، بعد میں جماعت صحابہؓ دو رائے میں تقسیم ہوگئی۔ خلافت و رحمت[14] کا یہ دور حضور اقدسؐ کی خاص صحبت و تربیت سے پیدا ہوا، جس میں بلا تفریق عرب و عجم تمام مسلمان حکومت میں شریک رہے۔ انسانی بنیادوں پر فیصلے ہوتے رہے۔ وحدتِ انسانیت پر مبنی اعلیٰ سوسائٹی قائم رہی۔ رہتی دنیا تک یہ دور انسانیت کے لیے نمونہ رہے گا۔

نمونے کے دور کی اہم خصوصیت

یہ دور نمونے کا ہے، جو خاص طور پر رسول اللہؐ کی صحبت سے پیدا ہوا، جو قیامت تک دوبارہ پیدا نہیں ہوسکتا۔ انسانی سوسائٹی ارتقا پذیر ہے۔ نمونے کے دور سے گزر کر انسانی سوسائٹی ارتقا کا اگلا قدم لے گی تو وہیں سے اپنا سلسلہ جوڑے گی، جہاں سے انسانیت نے چھوڑا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ساری انسانیت' انسانیت کی معراج خلافتِ راشدہ کی سطح پر آجائے۔ نمونے کے دور کے بعد انسانیت اپنی ارتقا کا قدم لیتی ہے اور قومی دور سے آغاز کرتی ہے۔

خلافتِ راشدہ کے مختلف ادوار کا جائزہ

دورِ خلافت حضرت ابوبکر صدیقؓ

۱۲ ربیع الاوّل ۱۱ھ/ 8 جون 632ء تا ۲۲ جمادیٰ الاخریٰ ۱۳ھ 22 اگست 634ء

حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام کے پہلے خلیفہ ہوئے اور آپؓ کی خلافت کا دورانیہ دو سال دو مہینے اور چودہ دنوں پر مشتمل ہے۔ یہ دور سب سے مشکل دور تھا کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے۔ اس کا جماعتِ صحابہؓ پر گہرا اثر تھا۔ آپؓ نے جماعت کے داخلی نظام کو مضبوط کیا اور اس کے ساتھ ساتھ بیرونی خطرات کا بھی مقابلہ کیا۔ آپؓ کی خلافت نے خلفائے راشدینؓ اور قیامت تک اسلام کے عادلانہ اصول پر قائم ہونے والی حکومتوں اور نظاموں کے لیے اساس اور بنیاد کا کردار ادا کیا۔ آپؓ نے اپنے پہلے خطبے میں خلافت کے اساسی اصولوں کو متعین کیا:

www.rahimia.org

''أمّا بعد! یا أیّها النّاس! فإنّی قد ولّیت علیکم و لست بخیرکم، فإن أحسنتُ أعینونی أو إن أسأت فقوّمونی، الصّدقة أمانة و الکذب خیانة، و الضّعیف فیکم قویٌّ عندی حتّٰی آخذ الحقّ منه إن شاء اللّٰه، لا یدع قوم الجهاد فی سبیل اللّٰه إلّا ضربهم اللّٰه بالذّلّ و لا تشیع الفاحشة فی قوم عمّهم اللّٰه بالبلاء، أطیعونی ما أطعت اللّٰه و رسولهٗ، فإذا عصیت اللّٰه و رسولهٗ فلا طاعة لی علیکم، قوموا إلیٰ صلاتکم یرحمکم اللّٰه. (15)

(اما بعد! اے لوگو! میں تمھارا حکمران بنایا گیا ہوں اور میں تم سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں درست کام کروں تو میری مدد کرنا اور اگر میں غلط کروں تو مجھے سیدھا کرو (میری اصلاح کرو)۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے۔ تمھارا کمزور شخص میرے نزدیک طاقت ور ہے، یہاں تک کہ اس کا حق اسے دلا دوں۔ انشاء اللہ۔ جب کوئی قوم جہاد فی سبیل اللہ سے منہ موڑ لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں ذلیل کر دیتا ہے۔ جس قوم میں فحشا (بے حیائی اور سماجی معاہدات کو توڑنا) عام ہو جائے تو اللہ تعالیٰ ان پر عمومی عذاب نازل کر دیتا ہے۔ میری اطاعت کرنا جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں۔ پھر جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔ نماز کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے۔)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالاتِ زندگی

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام عبداللہ ہے۔ اسلام سے پہلے عبدالکعبہ تھا، بعد میں رسول اللہؐ نے آپؓ کا نام عبداللہ رکھا۔ آپؓ کی کنیت ابوبکر اور لقب صدیق ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے کہ اس کی وَجہ یہ ہے کہ آں حضرتؐ نے حضرت جبرئیل امینؑ سے پوچھا کہ: ''میری قوم میں سے اس واقعے کی تصدیق کون کرے گا؟'' انھوں نے جواب دیا: ''ابوبکر صدیق، کیوں کہ وہ صدیق ہیں۔''(16) اسی طرح آپؓ کا ایک لقب عتیق بھی تھا، جس کی وَجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپؓ کو حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا:

''أنت عتیق اللّٰه من النّار.'' (17) (آپ اللہ کی طرف سے آگ سے آزاد ہیں۔)(18)

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی ولادتِ مبارکہ واقعۂ فیل کے تین برس بعد (574 ق م میں) مکہ میں ہوئی۔ آپؓ کے والد کا نام عثمان بن عامر اور کنیت ابوقحافہ اور والدہ کا نام ام الخیر سلمیٰ تھا۔ آپؓ قبیلۂ قریش کی ایک شاخ بنوتیم سے تعلق رکھتے تھے۔ آپؓ کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت پر سرکارِ دو عالمؐ سے مل جاتا ہے۔ آپؓ کا خاندانی پیشہ تجارت تھا۔ مکہ میں آپؓ کے خاندان کو نہایت معزز مانا جاتا تھا۔ رسول اللہؐ اور آپؓ کے درمیان بعثت سے قبل ہی گہرا تعلق اور باہمی اُنس و محبت تھی۔ ایک دوسرے کے پاس آمد و رفت، اہم معاملات پر صلاح مشورہ روز کا معمول تھا۔ آپؓ نے بعثتِ نبویؐ کے بعد بالغ مردوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ آپؓ نے اپنے مال سے حضرت بلالؓ سمیت کئی ایسے غلاموں کو آزاد کرایا، جن کو ان کے آقاؤں نے اسلام قبول کرنے کی پاداش میں سخت ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہوا تھا۔ آپؓ ہی کی دعوت پر حضرت عثمان غنیؓ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت سعد بن ابی وقاصؓ ایسے اکابر صحابہ ایمان لائے، جن کو بعد میں دربارِ رسالت سے ''عشرہ مبشرہ'' کی نوید عطا ہوئی۔ آپؓ کو ہجرتِ مدینہ میں رسول اللہؐ کی نہ صرف رفاقت اور تین دن غارِ ثور میں قیام، بلکہ اس کا مکمل انتظام و انصرام

کرنے کا شرف حاصل رہا۔ حضور اقدسؐ کا تاریخی جملہ ''لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا'' (19) جس کو قرآن حکیم نے محفوظ کرلیا، نے آپؓ کے اعلیٰ مقام پر مہرِ تصدیق ثبت کی۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان میں فرمایا کرتے تھے کہ: ''اے کاش میری زندگی بھر کے اعمال حضرت ابوبکرؓ کے ایک دن کے عمل کے برابر ہو جائیں، جو انھوں نے حضور اقدسؐ کے ساتھ غارِ ثور میں گزارا۔'' (20)

حضرت ابوبکر صدیقؓ تمام غزوات اور مہمات میں آپؐ کے دستِ راست اور مشیرِ خاص رہے۔ غزوۂ بدر میں حضورؐ نے آپؓ کی رائے کو پسند کرتے ہوئے قیدیوں کو فدیہ کے بدلے چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اسی غزوہ کے موقع پر جب آپؓ کے بڑے صاحبزادے عبدالرحمٰن، جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے، مقابلے پر آئے تو آپؓ تلوار نکال کر مقابلے پر جانے لگے تو حضورؐ نے یہ کہہ کر روک دیا کہ: ''تم مجھ کو اپنی ذات سے متمتع ہونے دو۔''

آپؓ غزوۂ اُحد میں حضورؐ کے ساتھ خصوصی دستے میں شریک رہے۔ غزوۂ خندق میں ایک دستے کی کمان آپؓ کے سپرد تھی۔ صلح حدیبیہ میں شرائط اور فیصلوں پر آپؓ کو نہ صرف اطمینان و انشراح تھا، بلکہ حضرت عمرؓ کو ان کے سوالات کے جوابات دے کر مطمئن کیا۔ غزوۂ خیبر میں قلعہ فتح کرنے کے لیے آپؓ کو امارت دی۔ ایک روایت کے مطابق سریہ بنوفزارہ کی امارت بھی آپؓ کے سپرد تھی اور آپؓ ہی کی قیادت میں بنوکلاب کی سرزنش کے لیے سریہ بھیجا گیا۔ حج فرض ہونے کے بعد پہلے امیرالحج ہونے کا اعزاز بھی آپؓ کو ہی حاصل ہوا۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر حضورؐ کے ساتھ شریک رہے۔ حضور اقدسؐ کے دنیا سے رفیقِ اعلیٰ کے سفر کی خبر سب سے پہلے آپؓ کو ہوئی۔ آپؓ کو ہی حضورؐ نے اپنی علالت کے دنوں میں اپنے مُصلّے پر کھڑا کیا اور آپؓ ہی نماز پڑھا رہے تھے کہ حضورؐ تشریف لائے تو آپؓ نے پیچھے ہٹنا چاہا تو حضورؐ نے آپؓ کو ہاتھ کے اشارہ سے منع فرمایا اور آپؓ کی دائیں جانب بیٹھ کر نماز ادا کی۔

خلافتِ راشدہؓ کا یہ دور قومی انقلاب کے استحکام کا دور ہے۔ قومی انقلاب حضورِ اقدسؐ کی زندگی میں فتحِ مکہ کے ساتھ مکمل ہوا تھا اور اس قومی نظام کا مرکز مدینہ منورہ تھا، لیکن اس کے بعد بھی اس کو بہت سارے challenges کا سامنا تھا، اس کے استحکام کے لیے اقدامات اٹھانے کی ضرورت تھی۔ امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا دور حضورؐ کے دور کا تتمہ اور تکملہ ہے۔ گویا حضور اکرمؐ اور ابوبکر صدیقؓ کا دور باہم مل کر قومی انقلاب کے قیام اور استحکام کا دور بن جاتا ہے۔

اس دور میں قومی انقلاب کے لیے مندرجہ ذیل challenges تھے، جن کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حکمتِ عملی بنا کر حل کیا۔ ذیل میں ان کا احاطہ کیا جائے گا۔

دینِ اسلام کے بین الاقوامی غلبے کے صدیقی اقدامات

1۔ لشکرِ اسلام کی روانگی: حضور اقدسؐ نے اپنی حیات کے آخری دنوں ۱۱ھ میں بلقاء اور فلسطین کے علاقوں میں رومیوں کے جہاد کے لیے لشکر تیار کیا۔ اس لشکر میں کبار مہاجرین و انصار صحابہؓ شامل تھے۔ اور اس کا سپہ سالار حضرت اُسامہؓ کو مقرر کیا۔ لشکر روانہ ہونے والا تھا کہ حضور اقدسؐ کا وصال ہوگیا۔ لشکر کا جانا ملتوی ہوگیا۔ بعد میں صحابہ کرامؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو رائے دی کہ ایک تو حالات ایسے نہیں ہیں کہ لشکر روانہ کیا جا سکے، اس لیے فی الحال لشکر کو روانہ نہ کریں۔ اگر لشکر کو بھیجنا ہی ہے تو پھر لشکر میں

بڑے جلیل القدر صحابہ کرامؓ موجود ہیں، یہاں تک کہ حضرت عمر فاروقؓ بھی اس لشکر کا حصہ ہیں اور لشکر کا سپہ سالار ایک نوجوان اسامہ بن زیدؓ ہیں، اس لیے اس لشکر کا سپہ سالار کسی اَور کو بنا دیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ: ''اللہ کی قسم! جس کو حضورؐ نے سپہ سالار بنایا ہے، کوئی وَجہ نہیں کہ میں اس کو سپہ سالاری سے معزول کروں۔'' پھر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت اسامہؓ سے درخواست کی کہ آپ اس لشکر کے سپہ سالار ہیں اور عمرؓ اس فوج کے ایک سپاہی ہیں اور ان کی مجھے یہاں کاروبارِ خلافت میں ضرورت ہے۔ اگر آپ بہ خوشی اجازت دیں تو میں عمر فاروقؓ کو روک لیتا ہوں۔ انھوں نے اجازت دی تو حضرت فاروقِ اعظمؓ کو آپؓ نے امورِ خلافت میں معاونت کے لیے مدینہ میں روک لیا۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے لشکر کو روانہ کرتے وقت دس باتوں کی تلقین کی اور اس کو اچھی طرح یاد رکھ کر عمل کرنے کی نصیحت کی: (۱) خیانت نہ کرنا۔ (۲) مالِ غنیمت میں چوری نہ کرنا۔ (۳) بدعہدی نہ کرنا۔ (۴) لاشوں کی بے حرمتی نہ کرنا۔ (۵) پھل دار درخت نہ کاٹنا۔ (۶) بلاضرورت بکری، گائے اور اونٹ ذبح نہ کرنا۔ (۷) گرجا گھروں میں عبادت میں مصروف لوگوں سے تعرّض نہ کرنا۔ (۸) تمھارے پاس طرح طرح کے کھانے لائے جائیں گے، کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا۔ (۹) تمھارے پاس ایسے لوگ آئیں گے، جن کے سر درمیان سے مونڈے ہوئے ہوں گے اور اطراف سے لمبے بال رکھے ہوں گے، ان کو تہ تیغ کر دینا۔ (۱۰) اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اس کے اعتماد پر جہاد کے لیے روانگی کرنا۔ اور ساتھ ہدایت دی کہ ابتدا بلا دقضاعہ سے کرنا، پھر ابل پر حملہ آور ہونا۔ حضرت اُسامہ نے حکم کی تعمیل کی اور چالیس دن کے اندر مالِ غنیمت اور فتح کے ساتھ سرخرو ہو کر لوٹے۔ (21)

اس طرح دنیا کو ایک پیغام دیا گیا کہ حضور اکرمؐ کے دنیا سے رخصت ہونے کے ساتھ دین کی حکومت ختم نہیں ہوگئی، بلکہ ان کی جماعت کی اجتماعی طاقت اور قوت نے اپنا وجود منوایا۔ اس کا پوری دنیا پر بڑا رعب پڑا کہ نبویؐ انقلاب کے اقدامات آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس سے مسلمان جماعت کا مورال مضبوط اور مستحکم ہوا اور حضورؐ کے فیصلوں کا تسلسل آگے بڑھا۔

2۔ منکرین زکوٰۃ کی سرکوبی: حضور اقدسؐ کے بعد کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کو تاریخ میں منکرینِ زکوٰۃ کہتے ہیں۔ لیکن اس سے ایک غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ گویا اس طبقے نے زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار کر دیا تھا۔ یہ غلط ہے۔ ان لوگوں نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا اور نہ زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کیا تھا، بلکہ وہ انکار اس چیز کا کر رہے تھے کہ رسول اللہؐ جب اس دنیا میں موجود تھے تو وہ اللہ تعالیٰ کے نبی اور امام الانبیا تھے۔ ان کو حق حاصل تھا کہ ہم سے ہمارے اموال زکوٰۃ کی صورت میں لے کر تقسیم کریں۔ ان کے بعد کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ عوام الناس کی زکوٰۃ لے کر تقسیم کرے۔ لہٰذا ہم یہ زکوٰۃ دیں گے، لیکن خود دیں گے، حکومتی کارندوں کو نہیں دیں گے۔ (22)

منکرینِ زکوٰۃ کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مؤقف: یہ نظام کے لیے ایک چیلنج تھا۔ بات بہ ظاہر ایک چھوٹی سی تھی، لیکن حقیقت میں یہ نظامِ حکومت کو چیلنج کرنا تھا، کیوں کہ اگر مالیاتی نظام کو سسٹم سے نکال لیا جائے تو نظام ہی ختم ہو جائے گا۔ اس ذہنیت کے لوگوں کے خلاف حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جہاد کیا اور اعلان کیا کہ: ''اللہ تعالیٰ کی قسم! اگر یہ بھیڑ کے بچے کی زکوٰۃ بھی رسول اللہؐ کو دیتے تھے تو میں اس کے نہ دینے پر ان سے قتال کروں گا۔'' (23) حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمر فاروقؓ کے اس سوال پر کہ ''جو لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، ہم ان کے خلاف کیسے جہاد کر سکتے ہیں؟'' فرمایا کہ:

''و اللّٰہ لأقتلنّ من فرّق بین الصّلوٰۃ و الزّکوٰۃ، فإن الزّکوٰۃ حق المال، و اللّٰہ لو منعونی عناقاً

كانوا يؤدّونهٗ إلٰى رسول اللّٰه لقاتلتهم منعها.'' (24)

(اللہ کی قسم میں اس شخص سے جنگ ضرور لڑوں گا، جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔)

یہ قومی انقلاب میں بڑا رخنہ پیدا کرنے کی کوشش تھی اور یہ اس وقت کا ایک بہت بڑا چیلنج تھا۔

3۔ ردِ انقلاب اور مدعیانِ نبوت کا خاتمہ: قومی انقلاب کو مستحکم کرنے کے لیے ردِ انقلاب کا خاتمہ کرنا۔ حضوؐر کے سانحۂ ارتحال کے بعد قبائل کے رجعت پسند طبقات نے ردِ انقلاب اختیار کیا تھا۔ حضوؐر کا انقلاب مذہب اور دین کے عنوان اور قرآنِ حکیم کے حوالے سے تھا۔ ایک دینی نمائندہ جو اللہ تعالیٰ کا رسول ہے، انھوں نے یہ انقلاب برپا کیا تھا۔ اب وہ لوگ جنھوں نے (ماحول کے) دباؤ میں آ کر اس انقلاب کو قبول کیا تھا، لیکن وہ انقلاب کی روح کو اپنے مفادات کے خلاف سمجھتے تھے اور یہ باتیں ان لوگوں سے ظاہر ہوئیں تو ان لوگوں کا ردِعمل (reaction) بھی مذہبی رنگ میں ہوا۔ اس لیے مدعیانِ نبوت مختلف علاقوں میں پیدا ہوئے، جنھوں نے نبوت کے دعوے کیے۔ یہ اصلاً انقلاب کے خلاف رجعت پسندی کے مظاہرے تھے، جو اس وقت اس عنوان سے پیدا ہوئے، جس عنوان سے انقلاب لایا گیا تھا۔ تو انھوں نے اس کو شکوک وشبہات میں ڈالنے کے لیے دعویٰ ہائے نبوت کی ایک چین چلائی۔ (25)

4۔ جمع وحفاظتِ قرآن: آئندہ کے لیے ایک بڑا چیلنج قرآن حکیم سے متعلق تھا۔ نبی کریمؐ کے دور میں قرآن حکیم کا کوئی ایسا نسخہ نہیں تھا کہ جس کو حتمی قرار دے کر کسی خاص جگہ محفوظ کر لیا گیا ہو۔ جب وحی آتی تو حضور اکرمؐ کاتبینِ وحی کو بلا کر اُن سے وہ آیات لکھواتے اور بتاتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد لکھ لو۔ اگرچہ ان کاتبینِ وحی کے پاس قرآنِ حکیم موجود تھا اور ترتیب کے ساتھ موجود تھا، البتہ حضرت ابوبکرؓ نے ان کاتبین کے نسخوں کو جمع کر کے ایک نسخہ بنا کر محفوظ کر لیا۔ گویا حضرت ابوبکر صدیقؓ سب سے پہلے جامع اور مدونِ قرآن ہیں، جنھوں نے ایک مکمل نسخہ بنوا کر مصحف کی صورت میں محفوظ کر لیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس اقدام سے قرآن میں کسی بھی قسم کے تغیر وتبدل یا شکوک وشبہات کو پیدا کر کے مستقبل میں انقلاب کو ناکام بنانے کا خدشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ کیوں کہ اس انقلاب کی اساس ہی قرآنِ حکیم ہے۔

ایک روز آپ ﷺ منبر پر تشریف لائے اور خطاب فرمایا:

''**رأيتُ في ذراعي سوارين من ذهب، فكرهتهما، فنفختهما فطارا، فأوّلتهما هٰذين الكذابين: صاحب اليمن و صاحب اليمامة.**'' (26) (میں نے (خواب میں) اپنے ہاتھ میں دو سونے کے کنگن دیکھے تو مجھے سخت ناگوار گزرا۔ پھر میں نے انھیں پھونک ماری تو وہ غائب ہو گئے۔ میں نے اس کی تعبیر دو جھوٹے مدعیانِ نبوت کے ساتھ کی ہے: ایک یمن والا (اسود عنسی) اور دوسرا یمامہ والا (مسیلمہ کذاب)۔''

حجۃ الوداع کے بعد حضوؐر جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو بیمار ہو گئے، جس کی خبر لوگوں میں مشہور ہوئی تو جن کے دل بغض وعداوت سے بھرے ہوئے تھے، ان میں بغاوت کی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ اس کے دو بڑے مراکز تھے: یمن اور یمامہ۔ یمن میں اسود عنسی نے اور یمامہ میں مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ یہ دونوں فتنۂ ارتداد میں بڑے سرگرم تھے اور ان کے ذہن میں اسلام کی طرف لوٹنے کا کوئی خیال نہ تھا۔ ان کے پاس بے پناہ افرادی اور مالی قوت تھی، جس کے نشے نے ان کو سحر میں مبتلا کیا ہوا تھا۔ اور جیسے ہی حضور اقدس ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے تو انھوں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔

مدعیانِ نبوت کے حوالے سے صدیقی مؤقف: آپؓ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے مدعیانِ نبوت کے بارے میں بہت ہی واضح مؤقف اختیار کرتے ہوئے ردِ انقلاب کی ان تحریکوں کو طاقت سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔ آپؓ نے فرمایا:

''و اللّٰہ لا أدع أن اُقاتل علٰی أمر اللّٰہ، حتّٰی ینجز اللّٰہ وعدہ، یوفی لنا عھدہٗ، و یقتل من قُتل شھیداً من أھل الجنّۃ، و یبقٰی خلیفتہ و ذریتہ فی أرضہٖ، قضاء اللّٰہ الحقّ، و قولہٗ الّذی لا خلف لہٗ:
وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (27)'' (28)

(اللہ کی قسم میں اس وقت تک قتال کرتا رہوں گا، جب تک اللہ تعالیٰ ہم سے اپنا وعدہ پورا نہ کردے اور اپنے عہد کو پورا نہ کردے اور جنت کے حق دار لڑ کر شہید نہ ہو جائیں اور یہ کہ خلیفہ اور اس کی اولاد جنت سے پیچھے نہ رہ جائیں۔ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق ہے اور اس کے فرمان کے خلاف کبھی نہ ہوگا: ''وعدہ کرلیا اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں ایمان لائے ہیں اور کیے ہیں انھوں نے نیک کام، البتہ پیچھے حاکم کردے گا اُن کو ملک میں، جیسا حاکم کیا تھا ان سے اگلوں کو۔'')

حضرت ابوبکر صدیق نے گیارہ لشکر ترتیب دے کر مختلف قبائل میں ردِ انقلاب کی ان تحریکات کو کچلا اور خطوط کے ذریعے قبائل کے مخلص لوگوں کو لشکرِ اسلام کا حصہ بنا کر انھیں جہاد پر آمادہ کیا اور بالآخر ان تحریکات کا زور ٹوٹا اور اللہ تعالیٰ نے دینِ حق کو سربلندی عطا کی۔ (29)

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ

خلیفۂ دوم کا نام عمر بن خطاب، لقب فاروق اور کنیت ابوحفص ہے۔ آپؓ کی پیدائش: 586ء تا 590ء کے درمیان مکہ میں ہوئی اور شہادت 7 نومبر 644ء مدینہ میں ہوئی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے بعد مسلمانوں کے دوسرے خلیفہ راشد، حضور اکرمؐ کے خسر اور تاریخِ اسلام کی اہم ترین شخصیات میں سے ایک ہیں۔ حضرت عمرؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ ان کا شمار فقہا صحابہؓ میں اوّل درجے پر ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات کے بعد ۲۲/ جمادیٰ الثانی ۱۳ھ/ 23/ اگست 634ء کو مسندِ خلافت سنبھالی۔ حضرت عمرؓ ایک باعظمت، انصاف پسند اور عادل حکمران مشہور ہیں۔ ان کی عدالت میں مسلم و غیر مسلم دونوں کو یکساں انصاف ملا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ عدل و انصاف انتہائی مشہور ہوا اور ان کے لقب ''فاروق'' کی دیگر وجوہ تسمیہ میں سے ایک وجہ یہ بھی بنی۔ آپؓ مکہ میں پیدا ہوئے اور ان چند لوگوں میں سے تھے، جو لکھ پڑھ سکتے تھے۔ علمِ اَنساب، سپہ گری، پہلوانی اور خطابت میں آپؓ طاق تھے۔ ہجرت کے موقع پر کفارِ مکہ کے شر اور تصادم سے بچنے کے لیے سب نے خاموشی سے ہجرت کی، مگر آپؓ کی بہادری اور غیرتِ ایمانی نے چھپ کر ہجرت کرنا گوارا نہیں کیا۔ آپؓ نے تلوار ہاتھ میں لی، کعبہ کا طواف کیا اور کفار کے مجمع کو مخاطب کر کے کہا: ''تم میں سے اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہو کہ اس کی بیوی بیوہ ہوجائے اور اس کے بچے یتیم ہوجائیں تو وہ مکہ سے باہر آ کر میرا راستہ روک کر دیکھ لے۔'' مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ آپؓ کا راستہ روک سکتا۔ مواخاتِ مدینہ میں قبیلہ بنو سالم کے سردار عتبان بن مالکؓ کو آپؓ کا بھائی مقرر کیا گیا۔ حضرت عمرؓ حضورؐ کے ساتھ تمام غزوات (غزوۂ بدر، غزوۂ اُحد، غزوۂ خندق، غزوۂ خیبر، فتح مکہ، غزوۂ حنین، غزوۂ تبوک) میں شریک رہے اور دیگر اہم واقعات و معاہدات جیسے تمام غزوات، بیعت الرضوان اور صلح حدیبیہ وغیرہ میں نمایاں حیثیت میں شریک ہوئے۔ ایک غلام ابولولو فیروز نے آپؓ پر فجر کی نماز میں مسجدِ نبویؐ میں خنجر سے حملہ کیا اور تین جگہ وار کیے۔ آپؓ ان زخموں سے جانبر نہ ہوسکے اور شہادت کے عظیم منصب پر فائز ہوگئے۔

www.rahmia.org

دورِ خلافت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہٗ

۲۲ر جمادیٰ الاخریٰ ۱۳ھ/ 22ر اگست 634ء تا ۲۶ر ذوالحجہ ۲۳ھ/ 6ر نومبر 644ء

حضرت عمرؓ اسلام کے دوسرے خلیفہ راشد ہیں۔ آپؓ کی خلافت کا دورانیہ دس سال دو ماہ اور چودہ دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؓ کے ہاتھ پر اسلام کو بین الاقوامی فتح عطا کی۔ حضرت عمرؓ ہجری تقویم کے بانی ہیں۔ ان کے دورِ خلافت میں عراق، مصر، لیبیا، سرزمینِ شام، ایران، خراسان، مشرقی اناطولیہ، جنوبی آرمینیا اور سجستان فتح ہو کر مملکتِ اسلامی میں شامل ہوئے اور اس کا رقبہ بائیس لاکھ اکاون ہزار تیس (22,51,030) مربع میل پر پھیل گیا۔ حضرت عمرؓ ہی کے دورِ خلافت میں یروشلم/ بیت المقدس فتح ہوا۔ اس طرح ساسانی (فارس / ایران کی) سلطنت کا مکمل رقبہ اور بازنطینی (مشرقی روم کی) سلطنت کا تقریباً تہائی حصہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگیں آ گیا۔ حضرت عمرؓ نے جس مہارت، شجاعت اور عسکری صلاحیت سے ساسانی سلطنت کی مکمل شہنشاہیت کو دو سال سے بھی کم عرصے میں زیر کر لیا، نیز اپنی سلطنت و حدودِ سلطنت کا انتظام، رعایا کی جملہ ضروریات کی نگہداشت اور دیگر امورِ سلطنت کو جس خوش اسلوبی اور مہارت و ذمہ داری کے ساتھ نبھایا، وہ ان کی عبقریت کی دلیل ہے۔

دوسرا دور قومی سیاسی اور معاشی نظام کی تشکیل کا دور ہے۔ تشکیل کا زیادہ کام حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ہوا اور حضرت عثمان غنیؓ اس کی تکمیل کر جاتے ہیں۔ (30) گویا حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ادوار کو تشکیل و تکمیل کا دور کہیں گے۔

دورِ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے بارے میں امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی رائے

حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلویؒ حضرت عمرؓ کے دور کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ آپؒ چاروں خلافتوں (خلافتِ راشدہ اور بعد کے ادوارِ خلافت؛ خلافتِ بنواُمیہ، خلافتِ بنوعباس، خلافتِ بنوعثمان)، چاروں فقہ (فقہ حنفی، فقہ شافعی، فقہ مالکی، فقہ حنبلی) اور تصوف کے چاروں سلسلوں (قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ) کی اساس خلافتِ عمرؓ کو قرار دیتے ہیں۔ آپؓ کے بارے میں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔''

اس دور میں علوم کی تدوین کی بنیادیں قائم کی گئیں۔ بین الاقوامی غلبے کے اقدامات بھی اسی دور میں ہوئے۔ (31)

حضرت فاروقِ اعظمؓ کے اقدامات

حضرت عمرؓ کے دور میں نبوی انقلاب بین الاقوامی غلبے کے مرحلے میں داخل ہوا۔ اس حوالے سے آپؓ نے درجِ ذیل اقدامات کیے:

1۔ منظّم فوج کی تشکیلِ نو: بین الاقوامی غلبے کے لیے منظّم فوج کی ضرورت تھی۔ قیصرِ روم اور کسریٰ ایران کے ساتھ مقابلہ بے ہنگم نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لیے منظّم (Organized) اور تربیت یافتہ لوگوں کی ضرورت تھی۔ قیصر و کسریٰ کے پاس تربیت یافتہ فوج تھی۔ کیوں کہ ان کی آپس میں بہت ساری جنگیں بھی ہوئی تھیں، جس کے نتیجے میں ان کی فوجیں منظّم ہوئیں۔ اس لیے ان کے مقابلے کے لیے منظّم فوج کی ضرورت تھی۔ حضرت عمرؓ نے فوج کی تنظیمِ نو کر کے ان کی ٹریننگ کا بندوبست کیا۔ (32)

2۔ جیل خانہ جات کا قیام: اسی طرح کچھ اَور امور سامنے آئے، جن کی وجہ سے جیل خانے کی ضرورت پڑی۔ جیل سے

مراد پاکستانی عقوبت خانے نہیں، بلکہ اس سے مراد وہ تربیت گاہیں ہیں کہ جن سے گزار کر لوگوں کی اصلاح کی جا سکے۔ (33)

3۔ محکمہ پولیس/کوتوال کا قیام: اندرونِ ملک شہری امن کے قیام کے لیے ایک محکمہ قائم کیا گیا۔ آج کے دور میں اس کو پولیس کہتے ہیں، یعنی وہ انتظامیہ جس کی ذمہ داری شہر کے امن و امان کے قیام کی تھی۔ (34)

4۔ صوبہ جات کی حدود کا تعین: اس سے قبل تمام مفتوحہ علاقے ایک ملک میں ضم ہو جایا کرتے تھے اور ایک خلیفہ اس کو دیکھتا تھا۔ کوئی ایسا انتظام نہیں تھا کہ ان کے لیے الگ سے انتظام و انصرام کا بندوبست کیا جائے، جیسے صوبے اور علاقے وغیرہ۔ حضرت عمرؓ نے پہلی بار صوبوں کی حدود متعین کیں اور ان کے لیے گورنر مقرر کیے۔ گویا خلافت کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک انتظامی ہرارکی (Hierarki) بنائی۔ (35)

5۔ گورنروں کے تقرر و تنزل اور محاسبے کے معیارات: خلافتِ راشدہ سے قبل دیگر نظاموں میں اگر گورنر بنائے بھی جاتے تھے تو وہ اپنے زمانے کے مزاج کے مطابق بادشاہ بن بیٹھتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ان کے احتساب کا باقاعدہ نظام بنایا۔ حج کے موقع پر تمام گورنرز کو بلاتے اور ان سے میٹنگ کی جاتی تھی۔ لوگوں کو بلایا جاتا تھا کہ ان گورنروں کے خلاف تمھاری کیا شکایات ہیں؟ یوں ان کا تقرر و تنزل وہیں کر دیا جاتا تھا اور وہیں احتساب بھی کیا جاتا تھا۔ (36) گویا ان کے خلاف پوچھ گچھ کا مکمل نظام متعین کیا گیا تو حضرت عمرؓ نے گورنروں کے محاسبے کا بہترین نظام قائم کیا، (37) جس میں احتساب کی بابت کئی ایک واقعات مشہور و معروف ہیں۔ (38)

نیز جس کو گورنر مقرر کرتے تو اس وقت ان کے تمام اثاثہ جات ظاہر کر دیے جاتے تھے کہ ان کے پاس کیا کیا چیزیں ہیں؟ اثاثہ جات کیا ہیں؟ کپڑے کتنے ہیں؟ ان کے پاس مکانات کتنے ہیں؟ آمدن کے ذرائع کیا ہیں؟ ان کا پورا پورا حساب لے کر محفوظ کرتے تھے (39) کہ گورنر بننے کے بعد اس میں کوئی اضافہ تو نہیں ہوا۔ کوئی چیز بڑھی تو نہیں ہے۔ اگر بڑھی ہے تو کہاں سے بڑھی ہے۔ باقاعدہ احتساب کا نظام ان کے ہاں موجود تھا۔ (40)

6۔ ڈاک کا نظام: فتوحات کے نتیجے میں خلافت کے زیرنگیں علاقہ پھیل گیا تو اس پورے علاقے میں خبروں کی ترسیل کی ضرورت پیش آئی۔ آپ نے ڈاک یعنی خبر رسانی کا ایک بہترین سسٹم بنایا۔ جگہ جگہ اس کے مراکز قائم کیے۔ جہاں پر بڑے تیز دوڑنے والے گھوڑے اور شاہ سوار رکھے ہوئے تھے۔ وہ گھوڑا جتنی مسافت تک آسانی سے دوڑ سکتا تھا، وہاں تک وہ خبر پہنچاتا۔ آگے دوسرا گھوڑا تیار ہوتا تو وہ اگلی چوکی تک پہنچاتا۔ یوں جو پیغام مہینے میں پہنچتا تھا، وہ دو تین دنوں میں پہنچ جاتا تھا۔ یوں خبروں اور اطلاعات پہنچانے کا مضبوط نظام قائم کیا گیا، جس کی وجہ سے تمام علاقے باہم مربوط ہو گئے۔

7۔ آب پاشی کے لیے نہروں کا نظام: زرعی دور میں اہم ترین وسیلۂ دولت 'زمین' ہوتی ہے اور زمین کے لیے پانی کا انتظام ضروری ہوتا ہے۔ آپؓ نے زراعت اور آب پاشی کے لیے نہروں کا پہلی بار بڑا بہترین نظام قائم کیا۔ (41)

8۔ مسافر خانہ اور سڑکوں کا نظام: سفر کے راستوں کو محفوظ کیا۔ جہاں لوگوں کو ٹھہرنا ہوتا، وہاں مسافر خانے تعمیر کروائے، جس میں ٹھہرنے، کھانے اور پینے کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔ سڑک اور راستے متعین کیے کہ کون سے راستے قریب پڑتے ہیں، اور ان کو باسہولت اور محفوظ بنایا۔ یوں تعلیم اور تجارت کے سفر آسان ہوئے۔ نیز نقشے بنائے، جس سے ہر قسم کے سفر آسان ہو گئے۔ (42)

www.rahimia.org

9۔ اراضی کا قومی ملکیت میں لینا: مفتوحہ علاقوں کی جاگیروں اور زمینوں کو قومی ملکیت میں لیا۔ کئی مہینوں تک شوریٰ میں اس پر بحث مباحثہ کر کے قرآن وسنت کی روشنی میں اجماع سے خراجی زمینوں کو قومی ملکیت قرار دیا۔ اس وقت پیدائشِ دولت کا بڑا ذریعہ زمین تھا۔ اگر یہ ساری زمین ان مجاہدین میں تقسیم ہو کر ان کی شخصی ملکیت میں آتی تو اس سے جاگیرداری اور سرمایہ داری پیدا ہوتی۔ اور زمین کے تقسیم در تقسیم کے عمل سے گزرنے کی وَجہ سے زمین کی پیداواری صلاحیت ختم ہو کر رہ جاتی۔ یوں اس فیصلے سے جاگیرداری اور سرمایہ داری کا راستہ روک دیا۔ (43)

10۔ مجلسِ شوریٰ کا نظام: مشاورتی بورڈ جس کو شوریٰ یا پارلیمنٹ کہا جاتا ہے، قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے اس کے مستقل افراد نہ تھے۔ (44) جو افراد حاضر ہوتے یا جن کے مشورے کی ضرورت ہوتی، ان کو بلا کر مشورہ لے لیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں باقاعدہ مشاورتی بورڈ قائم کیا گیا۔ یوں بین الاقوامی غلبے کی تکمیل کرنے میں مدد ملی۔ ایک حقیقی جمہوری نظام کا تصور پیدا ہوا۔ (45)

11۔ آزادیٔ رائے اور عدلِ عمرؓ: ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مسجد میں منبرِ رسول پر کھڑے خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور کہا کہ اے عمر! ہم تیرا خطبہ اس وقت تک نہیں سنیں گے، جب تک آپ یہ نہ بتاؤ گے کہ جو کُرتہ آپؓ نے پہنا ہوا ہے وہ زیادہ کپڑے سے بنا ہوا ہے، جب کہ بیت المال سے جو کپڑا ملا تھا، وہ اس سے بہت کم تھا۔ تو حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ مجمع میں میرا بیٹا عبداللہ موجود ہے، وہ اس سوال کا جواب دیں گے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کھڑے ہو گئے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے کہا کہ بیٹا! بتاؤ کہ تیرا باپ یہ کپڑا کہاں سے لایا ہے؟ ورنہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، میں قیامت تک اس منبر پر نہیں چڑھوں گا۔ حضرت عبداللہؓ نے بتایا کہ بابا کو جو کپڑا ملا تھا، وہ بہت ہی کم تھا، اس سے ان کا پورا کرتہ نہیں بن سکتا تھا اور ان کے پاس جو پہننے کا لباس تھا وہ بہت خستہ حال ہو چکا تھا۔ اس لیے میں نے اپنا کپڑا اپنے والد کو دے دیا۔ (46)

12۔ بجٹ کا نظام: سالانہ منصوبہ بندی کا نظام قائم کرتے ہوئے ہر معذور، بیوہ اور بوڑھے فرد کے لیے سالانہ بنیادوں پر قومی خزانے سے ادائیگی کا نظام بنایا، جو اُن کے گھر پر پہنچا دی جاتی۔ مشہور واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو پوچھا کہ: کیا آپ کو آپ کا خرچہ نہیں ملا؟ تو اس نے کہا کہ خرچہ تو یقیناً ملا ہے، لیکن مجھ پر حکومت کی طرف سے ٹیکس مقرر ہے۔ اگر میں اس کو جزیے میں دے دوں تو گھر کے نظام کو چلانے میں دِقت ہوگی۔ اگر گھر کے اخراجات میں استعمال کروں تو جزیے کی ادائیگی نہ ہو۔ تو حضرت عمرؓ نے شوریٰ کے مشورے سے باقاعدہ جزیے کی معافی کا نظام بھی وضع کیا۔ (47) اور بچوں کی پیدائش کے ساتھ ان کے دودھ کا خرچہ دینے کا انتظام کیا۔ (48) مساجد جو اس دور میں تعلیم کے مراکز تھے، ان کی دیکھ بھال اور ان کے لیے معلّمین کا تقرر کیا اور ان کی بیش بہا تنخواہوں کا انتظام کیا۔ (49)

13۔ سنِ ہجری کا آغاز: حضرت عمرؓ نے سنِ ہجری کا آغاز کیا، تاکہ تمام کام تاریخ وائز کیے جاسکیں اور تاریخی اعتبار سے تمام امور کو باہم مربوط کر سکیں۔ تاکہ غلبۂ دین کے لیے جو پروسیجر اختیار کیا گیا ہے، وہ ذہن نشین رہے۔ (50) غلبۂ دین کے لیے جو کردار ادا کیا گیا، وہ بھی اسی دور کے مرہونِ منت ہے۔ اسی دور میں قیصر و کسریٰ کو شکست ہوئی۔ گویا کہ اس دور میں جہاں قومی نظام کی تکمیل ہوئی، وہاں اداروں کی تشکیل اور بین الاقوامی غلبے کا کام مکمل ہوا۔ حضور اکرمؐ نے قیصر و کسریٰ کی شکست کو دین کا بین الاقوامی غلبہ قرار دیا ہے۔

www.rahimia.org

دورِ خلافتِ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہٗ

(۲۶/ذوالحجہ ۲۳ھ/ 6/نومبر 644ء تا ذوالحجہ ۳۵ھ/ 656ء)

۲۳ھ/644ء میں حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد مشورے سے آپؓ کو خلافت کی ذمہ داری سونپی گئی، جو آپؓ نے 644ء سے 656ء تک انجام دی، جو بارہ سال کا دورانیہ بنتا ہے۔ یہ خیرالقرون کا تیسرا دور ہے۔ حضرت عثمانؓ کی خلافت کو دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا دور غیر معمولی عروج و ترقی کا ہے، جس میں جماعتِ صحابہؓ میں اختلافِ رائے نہیں ہے، جب کہ دوسرا دور جماعتِ صحابہؓ میں اختلافِ رائے کا ہے۔ پہلے دور میں فتوحات اور توسیع مملکت کے بنیادی اقدامات اٹھائے گئے، جس کے نتیجے میں سکندریہ کی دوبارہ فتح، لیبیا، تیونس وغیرہ کو فتح کیا گیا۔ اور بحری بیڑا تشکیل دے کر جزیرہ قبرص، جزیرہ ارواد وغیرہ فتح کیے گئے۔ رومیوں کو سمندروں میں بھی شدید پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔ آپؓ ہی کے دور میں اندلس پر حملہ کر کے اس کے فتح کے راستے کو ہموار کیا گیا۔ (51)

حضرت عثمانؓ کے حالاتِ زندگی

حضرت عثمان بن عفانؓ (پیدائش: ۴۷ق ھ/ 577ء - شہادت: ۳۵ ھ/ 656ء) قریش کی شاخ بنواُمیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ عزت و شرف کے اعتبار سے یہ قبیلہ بنوہاشم کے بعد اعلیٰ مرتبہ شمار ہوتا تھا۔ حربِ فجار کی سپہ سالاری اسی قبیلے کے نام ور سردار حرب بن اُمیہ کو حاصل تھی۔ آپؓ اسلام کے تیسرے خلیفہ، دامادِ رسولؐ اور جامع قرآن تھے۔ قریش کا عام پیشہ تجارت تھا، اسی اعتبار سے آپؓ نے بھی تجارت کو اپنا پیشہ بنایا اور اس میں بڑی شہرت اور کامیابی حاصل کی اور ''غنی'' کا لقب حاصل کیا۔ آپؓ نے حضرت ابوبکر صدیق کی دعوت پر اسلام قبول کیا اور سابقینِ اسلام میں شامل ہوئے۔ آپؓ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ آپؓ کی کنیت ''ذوالنورین'' ہے، یعنی دونور والا۔ آپؓ کو نبی اکرمؐ کی دو صاحبزادیوں سے نکاح کا شرف حاصل ہوا۔ پہلے حضرت رُقیہؓ سے نکاح ہوا، پھر ان کی وفات کے بعد حضرت اُم کلثومؓ سے نکاح ہوا۔ ان کی وفات پر آپؐ نے فرمایا کہ: ''اگر میری تیسری بیٹی ہوتی تو اس کا نکاح بھی حضرت عثمان غنیؓ سے کر دیتا۔'' آپؐ نے دو مرتبہ ہجرت کی: پہلی حبشہ اور بعد ازاں ہجرتِ مدینہ منورہ۔ ۲ھ میں جب رسول اللہؐ کو خبر ملی کہ قبیلہ بنوثعلبہ اور محارب مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کے ارادہ سے جمع ہو رہے ہیں تو آپؐ ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے اور مدینہ منورہ کا انتظام حضرت عثمان غنیؓ کے سپرد کیا۔ آپؓ کا شمار اصحابِ بدر میں ہوتا ہے، لیکن عملاً آپؓ جنگ میں شریک نہیں ہوئے۔ اس موقع پر آپؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت رُقیہؓ بنت رسول اللہ سخت بیمار تھیں۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو مدینہ منورہ میں رہ کر ان کی دیکھ بھال اور علاج معالجے کا حکم دیا۔ حضرت رُقیہؓ اس بیماری سے صحت یاب نہ ہوسکیں۔ جب آپؐ بدر کی فتح کے بعد مدینہ منورہ میں داخل ہو رہے تھے تو حضرت عثمانؓ آپؓ کی تدفین میں مصروف تھے۔ آپؐ نے مالِ غنیمت میں ایک مجاہد کا حصہ آپؓ کو عنایت کیا۔ آپؓ دیگر غزوات؛ اُحد، خندق وغیرہ میں شریک رہے۔ غزوۂ ذات الرقاع میں بھی رسول اللہؐ نے آپؐ کو مدینہ منورہ کی نیابت سپرد کی۔

صلح حدیبیہ تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ آپؓ اس میں بھی نہ صرف شریک تھے، بلکہ حضور اقدسؐ کے سفیر کی حیثیت سے مکہ مکرمہ تشریف لے جا کر اہم ذمہ داریاں انجام دیں۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صحابہ کرامؓ میں سے حضرت عثمانؓ کو مسلمانوں کی طرف سے سفیر بنا کر بھیجا گیا تو صحابہ کرامؓ نے حضور نبی کریمؐ سے کہا کہ عثمانؓ کتنے خوش نصیب ہیں کہ انھوں نے بیت اللہ کا طواف

www.rahimia.org

اور صفا و مروہ کی سعی کی اور احرام کھول لیا ہوگا تو حضور نبی کریمؐ نے فرمایا: ''عثمان میرے بغیر ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔'' چناں چہ جب سیّدنا حضرت عثمان غنیؓ واپس تشریف لائے تو حضور اکرمؐ نے پوچھا: عثمان! کیا تم نے بیت اللہ کا طواف کیا؟ محبِّ رسولؐ نے آبدیدہ عرض کیا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں رسول اللہؐ کے بغیر بیت اللہ کا طواف کروں!'' بیعتِ رضوان بھی آپؓ کی شہادت کی خبر پر ہوئی اور اس میں رسول اللہؐ نے اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے صحابہ کرامؓ سے بیعت لی۔ رسولِ اکرمؐ حضرت عثمان غنیؓ پر مکمل اعتماد اور ان کی فطری حیا و شرافت اور مالی قربانی و ایثار جو انھوں نے اپنے مال کے ذریعے اہلِ ایمان کی نصرت کی تھی، اس کی انتہائی قدر کرتے تھے۔ رسول اللہؐ نے دیگر صحابہؓ کے ساتھ ان کو بھی جنت اور شہادت کی موت کی خوش خبری دی تھی۔

دورِ عثمانیؓ کے اقدامات

حضرت عثمان غنیؓ کے دورِ خلافت میں اسلام عرب سے نکل کر دور دراز عجمی علاقوں تک پھیل چکا تھا۔ اس حوالے سے جو مسائل پیش آئے، حضرت عثمانؓ نے انھیں حل کرنے کے لیے درج ذیل اقدامات کیے:

1۔ قرآن حکیم کے نسخوں کی تیاری: حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس سے، حضرت ابوبکر صدیقؓ کا تیار کردہ نسخہ یہ کہہ کر منگوایا کہ ہم اس سے نقل تیار کر کے اصل آپ کو واپس کر دیں گے، چناں چہ حضرت حفصہ نے وہ نسخہ بھیج دیا۔

الف: قرآنی نسخوں کی تیاری کے لیے کمیٹی: حضرت عثمان غنیؓ نے انصاری صحابی حضرت زید بن ثابتؓ کی نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل دے کر ان کو پابند کیا کہ وہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صحیفہ سے نقل کر کے قرآن کریم کے چند ایسے نسخے تیار کریں۔ کمیٹی میں تین قریشی صحابی حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، حضرت سعید بن العاصؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن الحارث بن ہشامؓ شامل تھے کمیٹی کو پانچ یا سات نسخے لکھنے کا حکم دیا گیا۔ ان سب کو حضرت عثمان غنیؓ نے یہ بھی ہدایت دی تھی کہ اگر کسی جگہ رسم الخط میں حضرت زید سے اختلاف ہو تو اس لفظ کو قریش کے رسم الخط کے مطابق لکھیں؛ اس لیے کہ قرآن مجید قریش کی لغت میں نازل ہوا ہے۔ (52)

معتبر روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ: پورے قرآن مجید کے کسی لفظ میں بھی ان لوگوں کا اختلاف نہیں ہوا۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا چار حضرات ''مجلس کتابت'' کے اساسی رکن تھے، ان کے علاوہ دوسرے حضرات اُبی بن کعبؓ، مالک بن ابی عامرؓ، کثیر بن افلحؓ، انس بن مالکؓ اور عبداللہ بن عباسؓ کو بھی قریش اور انصار میں سے منتخب کر کے ان کی معاونت میں دیا گیا تھا۔

ب: عہدِ عثمانی میں تیار کردہ نسخوں کی خصوصیات: حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قرآن حکیم کے جو جامع نسخے تیار کیے گئے، ان کی خصوصیات یہ تھیں:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں جو نسخہ تیار ہوا تھا، اس میں ساری سورتیں الگ الگ لکھی گئی تھیں، حضرت عثمانؓ نے تمام سورتوں کو اسی ترتیب سے یکے بعد دیگرے ایک ہی مصحف میں لکھوایا۔ (53)

۲۔ قرآن مجید ایسے رسم الخط میں لکھا گیا کہ ممکن حد تک متواتر قرأتیں اس میں سما جائیں۔

۳۔ حضرت عثمان غنیؓ نے جن حضرات کو قرآن حکیم کا نسخہ تیار کرنے کے لیے مامور فرمایا تھا، ان حضرات نے اسی نسخہ کو بنیاد بنایا تھا، جو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں تیار کیا گیا تھا۔ مزید احتیاط کے لیے وہی طریقہ اختیار فرمایا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں اختیار کیا گیا تھا۔

www.rahnuma.org

ج: حضرت عثمان غنیؓ نے قرآن حکیم کے پانچ یا سات نسخے تیار کرائے تھے، ایک نسخہ مدینہ منورہ میں رکھا گیا، اور بقیہ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ اور کوفہ کے مراکز میں بھیج دیے گئے۔ حضرت عثمان غنیؓ نے صحابہ کرام اور تابعین عظام کے پاس موجود سارے نسخوں کو تلف کرنے کا حکم نافذ فرما دیا تا کہ امتِ مسلمہ ایک رسم الخط پر متفق ہو جائے اور امت کی شیرازہ بندی باقی رہے۔ قرآن حکیم کو عرب کے مشہور سات لہجوں کے مطابق پڑھنے کی اجازت تھی، لیکن جب اس کی وجہ سے تفریق و تقسیم کا خدشہ پیدا ہوا، تو آپؓ نے ایک لہجے پر قرآن حکیم کو جمع کیا اور اس کو عام کیا۔ ہر شخص تک اس کی رسائی ممکن بنائی۔ کئی ایک نسخے بنا کر بڑے بڑے مراکز میں بھیجے گئے اور لوگوں کو اس کا پابند کیا کہ وہ اپنے مصاحف کو اس مصحف کے مطابق بنائیں۔ (54)

2۔ بحری فوج کا قیام: حضرت عمرؓ کے دور تک برّی میدانوں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑے گئے تو حضرت عثمانؓ نے بحری فوج بنا کر سطح سمندر اور جزائر پر بھی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ بحری بیڑہ بنایا۔ یوں حضرت عثمانؓ نیول فورس قائم کرنے والے پہلے خلیفہ ہیں۔ (55)

3۔ جمعہ کے دن دوسری اذان کا اضافہ: سیدنا عثمان غنیؓ کے زمانہ خلافت سے قبل جمعہ کی نماز میں ایک اذان اور ایک اقامت ہوتی تھی آپؓ کے عہد خلافت میں آبادی کی کثرت ہوگئی اور مدینہ طیبہ کے مکانات دور دور تک پھیل گئے۔ آپؓ نے جماعت صحابہ کی مشاورت سے مسجدِ نبوی کے ایک بلند ''مقامِ زوراء'' میں ایک اور اذان کا اضافہ کر دیا۔

4۔ مسجد نبویؐ کی توسیع: مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ ﷺ نے محسوس فرمایا کہ مسجد تنگ ہے کیونکہ نمازیوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ مسجد کے پڑوس میں ایک شخص کا مکان تھا آپؐ کی خواہش تھی کہ اس مکان کو خرید کر مسجد میں شامل کر لیا جائے چنانچہ ایک روز آپؐ نے اپنے خطبہ میں صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی اور جنت کا وعدہ فرمایا جس پر سیدنا عثمان غنیؓ بیس یا پچیس ہزار درہم میں وہ مکان خرید لیا اور حضورؐ کو اطلاع دی آپؐ بہت خوش ہوئے اور جنت کی خوشخبری دی۔ (56)

سنہ ۲۹ھ میں سیدنا عثمان غنیؓ نے اس میں مزید توسیع کی اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کا وہ مکان جس کا دروازہ جناب رسالت مآبؐ نے مسجد نبوی میں آنے جانے کے لیے کھلا رکھنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی خرید کر مسجد نبوی میں مزید توسیع فرمائی اور اسے چونا اور منقش پتھروں سے بڑے خوبصورت انداز میں تعمیر فرمایا۔ (57)

دورِ خلافت حضرت علی کرم اللہ وجہہ

(۲۴ ذوالحجہ ۳۵ھ/ 656ء تا ۱۷ رمضان ۴۰ھ/ 28 جولائی 661ء)

حضرت علیؓ کی بیعت اس وقت ہوئی، جب تاریخ اسلام اپنے نازک ترین موڑ پر کھڑی تھی۔ اور مشکل ترین حالات میں چار سال نو ماہ خلافت کی ذمہ داریوں کو بہ احسن طریقے سے نبھایا۔ (58) آپؓ کی خلافت کے قیام کی بنیاد حضرت عمرؓ کی قائم کردہ سات رُکنی کمیٹی تھی کہ جس میں دو افراد کو خلافت کے لیے نامزد کیا گیا تھا: حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ۔ حضرت عثمان غنیؓ کے بعد مسلمانوں کی اس رائے اور فیصلے کے مطابق حضرت علیؓ کا خلیفہ بننا ایک لازمی اور بدیہی امر تھا۔ سابقہ خلفا اور آپؓ کے دور میں یہ واضح فرق تھا کہ ان کے ادوار میں مسلمان جماعت کی رائے تقسیم نہیں ہوئی تھی، اور آپؓ کو خلافت اس وقت ملی، جب جماعت کی رائے واضح طور پر تقسیم ہو چکی تھی۔ آپؓ نے مدینۃ النبیؐ کو داخلی اختلافات سے محفوظ رکھنے کے لیے خلافت کا بین

الاقوامی مرکز کوفہ بنایا، جس کا واضح مقصد بین الاقوامی غلبے کو قائم رکھنے کے لیے مضبوط حکمتِ عملی اختیار کرنا تھا۔ آپؓ نے داخلی مسائل و اختلافات کے ساتھ ساتھ خوارج کا قلع قمع بھی کیا اور شام کی طرف پیش قدمی کو جاری رکھنے کی کوشش کی۔ (59)

حضرت علیؓ کے حالاتِ زندگی

علیؓ بن ابی طالب (599ء تا 661ء) ۱۳ رجب بروز جمعہ ۳۰ عام الفیل کو شہر مکہ میں خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ آپؓ کے والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد ہے۔ حضرت علی، پیغمبر اسلام ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں۔ بچپن میں پیغمبرؐ کے گھر آئے اور وہیں پرورش پائی۔ پیغمبرؐ کی زیرنگرانی آپؓ کی تربیت ہوئی۔ حضرت علیؓ پہلے بچے تھے، جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ آپؓ کی عمر اس وقت تقریباً دس یا گیارہ سال تھی۔ حضورؐ جب ہجرت فرما کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپؓ نے صحابہ کرامؓ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا۔ حضرت علیؓ سے فرمایا: ''آپ دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہیں۔'' (60) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''تم مجھ سے وہی نسبت رکھتے ہو جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ سے تھی مگر میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔'' (61) حضورؐ نے اپنی لختِ جگر حضرت فاطمہؓ کا نکاح آپؓ سے فرمایا۔

۱۹ رمضان المبارک ۴۰ھ کوفہ کی جامع مسجد میں صبح کے وقت آپؓ پر حملہ کیا گیا اور آپؓ ۲۱ رمضان کو خالق حقیقی سے جا ملے۔

دورِ علوی کے اقدامات

حضرت علیؓ کا دور فتنوں کے رفع کرنے کا دور ہے۔ انھوں نے اس دور میں جو فتنے پیدا ہوئے، ان کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے۔

1۔ خوارج کے فتنے کو دبانے کے لیے اقدامات: فتنوں میں خوارج کا فتنہ سرفہرست ہے۔ یہ اس دور کا شدت پسند گروہ تھا، جنھوں نے قرآن اور مذہب کے نام پر تسلسل کا انکار کیا اور قرآن کی آڑ لے کر انسانیت کو دھوکہ دیتے۔ سماجی انتشار پیدا کرتے۔ (62) امام شاہ ولی اللہ نے ''ازالۃ الخفاء'' میں احادیث جمع کر کے ان لوگوں کی علامات کو واضح کیا ہے:

۱۔ قرآن کریم کی تلاوت کریں گے لیکن قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔

۲۔ عبادات میں ایسا مبالغہ کریں گے کہ حضور نے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم ان کی نمازوں اور روزوں کے سامنے اپنی نمازوں اور روزوں کو حقیر سمجھو گے۔

۳۔ دین ان سے ایسے نکل جائے گا جیسے تیر شکار سے نکل جاتا ہے اور اس پر خون کا کوئی اثر دیکھائی نہیں دیتا۔

۴۔ پست عقل، بے وقوف لڑکے ہوں گے اور باتیں بہترین اعلیٰ ترین طبقہ کی کریں گے۔

رسول اللہ ﷺ جعرانہ کے مقام پر قیام پذیر تھے اور مال غنیمت میں سونا اور دیگر اموال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے تو ایک شخص آیا اور کہا کہ آپؐ انصاف نہیں کر رہے انصاف کے ساتھ تقسیم کیجئے، حضورؐ نے فرمایا: ''خرابی ہو تیری اگر میں انصاف نہ کروں گا تو میرے بعد کون کرے گا۔'' (63) علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ خوارج کی پہچان کرواتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''خوارج وہ لوگ تھے (جو امیر المومنین حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت امیر معاویہؓ کے خلاف لشکر میں شریک تھے) اور جب امیر المؤمنین سیدنا علیؓ بن ابو طالب نے (حضرت امیر معاویہؓ کے ساتھ اختلاف رفع کرنے کے لیے

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کو) حَکَم بنانے کا فیصلہ کیا تو (انھوں نے حضرت علیؓ) کے خلیفۃ المسلمین ہونے کا ہی انکار کیا تھا اور انھوں نے سیدنا علیؓ سے خروج کرتے ہوئے ان تمام اصحاب الرسول ﷺ سے جنگ کی تھی اور یہ خوارج مذکورہ بالا پاکیزہ اور نیک صحابہ کرامؓ کی تکفیر کر کے انتہائی سرکشی کرنے والے اور غلو سے کام لینے والے تھے۔''(64)

اس انتہا پسند گروہ نے قرآن مجید کی آیت ''اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ'' (65) کی خود ساختہ تشریح کی اور اپنی گھڑی اور سوچی ہوئی بات ہی کو حرفِ آخر سمجھ لیا۔ پھر ان کبار صحابہ کرام حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور عمرو ابن العاصؓ وغیرہ کو قابل گردن زدنی قرار دیا، جن کے حق ہونے پر واضح نصوص موجود ہیں۔

2۔ جنگِ نہروان/ خوارج کے خلاف جنگ: یہ ۳۷ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت علیؓ شام کے خلاف لشکر کشی کرنا چاہتے تھے۔ آپؓ کوفہ سے نخیلہ ایک کثیر تعداد میں فوج لے کر پہنچے اور لوگوں کو جہاد کی ترغیب دی اور دشمن کے مقابلے میں ثابت قدمی اور صبر کی تلقین کی۔ اسی دوران آپؓ کو اطلاع ملی کہ خوارج نہ صرف اس جنگ کے لیے تیار نہیں، بلکہ قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے راستوں پر بیٹھ کر لوگوں کو لوٹ رہے ہیں۔ حضرت علیؓ نے ان کی طرف سفیر بھیجا، تاکہ بات چیت کی جا سکے، لیکن انھوں نے بات چیت کا موقع ہی نہیں دیا اور سفیر کو شہید کر دیا۔ اس اطلاع پر حضرت علیؓ نے پہلے ان سے نمٹنا ضروری سمجھا۔ آپؓ خوارج کے پاس نہروان پہنچے اور ان کو نصیحت و تلقین کی، مگر وہ نصیحت ماننے کے بجائے خلیفہ کے خلاف صف آرا ہو گئے اور لشکر پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ کی فوج نے اس کو پسپا کر دیا۔ ان کو بُری طرح شکست ہوئی۔ (66)

3۔ دین کے عالمی غلبے کی روح کو باقی رکھتے ہوئے شعبہ جاتی تقسیم: حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ حضرت علیؓ کو امام ائمۂ انقلاب قرار دیتے ہیں کہ آئندہ دور میں جتنے بھی انقلابات آئیں گے، ان کے لیے حضرت علیؓ کا فکر و عمل بنیاد بنے گا۔ یعنی حضرت علیؓ کی جو فکر ہے، وہ قیامت تک کی انسانیت کے انقلابات کے لیے نمونہ بنے گی اور اسی فکر سے انقلابات آگے بڑھیں گے۔ (67)

4۔ مستقل نظامِ تربیت و تزکیہ کا قیام (68): قرآن حکیم فرقانِ حمید نے حضور اقدسؐ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ''ویزکیھم'' کو بھی قرار دیا ہے اور یہ تزکیہ کا علم ''سلوک و احسان'' کی صورت میں آگے بڑھا۔ اس علم اور دین کے اہم بنیادی شعبے کو صوفیائے کرام و علمائے ربانیین نے آگے بڑھایا۔ خلفائے راشدینؓ بعثتِ نبویؐ کے تمام علوم (شریعت، طریقت اور سیاست) کے جامع اور امام تھے اور آپؓ کی قیادت میں جماعتِ صحابہؓ سے اجتماعی طور پر یہ جامعیت منتقل ہوتی ہے۔ خلفائے راشدین کی بیعت کا مطلب کل دین (شریعت، طریقت و سیاست) میں ان خلفا کو امیر المؤمنین اور خلیفۃ المسلمین ماننا تھا۔ حضرت حسنؓ کا حضرت امیر معاویہؓ سے معاہدہ ہونے کے بعد سیاست خلفا کے پاس اور شریعت و طریقت کی امامت ائمہ اہل بیعت کے پاس آ گئی۔

خلفائے راشدینؓ کے بعد صحابہ و تابعین کی بڑی جماعت اس ذمہ داری کو اپنے پرانے طریقے پر پوری کرتی رہی۔ پھیلاؤ کی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ اس علم کے قوانین مرتب کیے جائیں۔ چناں چہ حضرت جنید بغدادی نے مقنن اوّل کی حیثیت سے اس علم کو بہ طور علم مدوّن کیا اور اس کے قوانین وضع کیے اور دیگر علوم کی طرح اس کو رطب و یابس سے پاک اور منزہ کر کے مرتب کیا۔ آخری خلیفہ راشد حضرت علیؓ ہیں۔ اس لحاظ سے بنیادی رہنمائی کا منبع آپؓ کی ذاتِ اقدس قرار پائی۔ اس لیے صوفیا کا اتفاق ہے کہ سلسلہ تزکیہ باطن کا فیض حضرت علیؓ سے آگے بڑھتا ہے اور اہل بیعت نے اس ذمہ داری کو ترجیح دے کر اختیار کیا اور اس کو علمی بنیادوں پر مستقل نظامِ تربیت و تزکیے کے طور پر لے کر چلے۔ (69)

دورِ خلافتِ راشدہ سے رہنمائی کے اہم پہلو

1۔ دین کے بنیادی ماخذ کی تعیین: دین کے بنیادی ماخذ چار ہیں: ۱۔ قرآن مجید، ۲۔ سنتِ نبویؐ، ۳۔ اجتماع، ۴۔ قیاس۔ قرآن حکیم کا جمع و تدوین اور اس کے مطالب کا قرآن وسنت کی اساس پر تعین اور سنت کو بہ طور ماخذِ اسلام تسلیم کرتے ہوئے سسٹم قائم کرنا۔ اور سنت کی درست تشریح و تفہیم اسی دور میں ہوئی اور قرآن وسنت کی اساس پر اُمت کو اجماع کے ذریعے جمع کرنا اور نئے پیش آمدہ مسائل کو قیاس سے حاصل کرنا۔ امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ اجماع کی وضاحت کرتے ہوئے "إزالة الخفاء" میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اجماع کا لفظ تم نے مجتہدین سے سنا ہوگا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام مجتہدین کسی زمانے میں کسی بات پر ایسے متفق ہوجائیں کہ کوئی بھی اس سے باہر نہ رہے۔ کیوں کہ یہ صورت نہ ہوئی ہے اور نہ ہوسکتی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفۂ خاص اہل الرائے سے مشورہ کرنے کے بعد یا بغیر مشورہ کیے ہوئے کوئی حکم دے اور وہ نافذ ہوجائے، یہاں تک کہ تمام عالم اسلام میں ایسی مضبوطی سے رواج پاجائے کہ کوئی اس کا مخالف نہ ہو۔''(70)

2۔ خلافتِ راشدہ دین کی تشریح، غلبہ واستحکام: خلفائے راشدین کے دور میں سب سے بنیادی اہمیت غلبہ دین اور اس کے نظریے کو رہی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلویؒ قرآن حکیم کی آیت "هو الذی ارسل رسولهٗ الخ" (71) کو قرآن، سنت اور خلافتِ راشدہ کے لیے بہ طور عنوان کے پیش کرتے ہیں۔ اس دور میں شریعت، طریقت اور سیاست کی جامعیت کے ساتھ دین اسلام کا فکر و فلسفہ، عدل و انصاف کی بنیاد پر معاشی نظام اور امن و امان کو یقینی بنانے کا سیاسی نظام تشکیل دیتے ہیں۔ یہ دور قیامت تک کے لیے حجت اور عنوان کا دور ہے۔

3۔ بین الاقوامی نظام کی تشکیل کے پہلو: آج کے دور میں دین کا غلبہ کیسے قائم ہوگا؟ نظام کی تشکیل کے پہلو کیا ہوں گے؟ اس کے لیے تین بنیادی اساسیات ہیں۔ سیاسی نظام میں بنیادی مسئلہ قیام امن کا، معاشی نظام میں اساسی مسئلہ معاشی خوش حالی پیدا کرنے کا، سماجی و فکری حوالے سے عدل و انصاف قائم کرنے کا ہے۔ ان تینوں اساسیات کا تذکرہ بخاری شریف کی کتاب الایمان کی حضرت عمار بن یاسرؓ والی حدیث میں کیا گیا ہے:

"ثلاث من جمعهن فقد جمع الإيمان'' کہ جس شخص نے ان تین چیزوں کو جمع کیا تو یقیناً اس نے ایمان جمع کرلیا:

1۔ **الإنصاف من نفسک:** عدل کی بالادستی ہو کہ انصاف تمہارے اندر سے پھوٹے۔ یعنی مزاج کا حصہ عدل و انصاف ہو۔ قرآن حکیم میں بھی آتا ہے کہ:

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا" (72) (اور کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کو ہرگز نہ چھوڑو۔)

2۔ **بذل السّلام للعالم:** پورے عالم کی امن وسلامتی کے لیے خود کو وقف کرنا۔ اپنے آپ کو قربان کرنا۔ وہ بھی صرف مسلمان کے لیے نہیں، بلکہ عالم انسانیت کے لیے۔

3۔ **الانفاق من الاقتار:** (73) جب وسائل کم ہوں، تو ایسا نظام تشکیل دینا کہ کم وسائل درست تقسیم کرکے خوش حالی پیدا کرنا۔ یعنی وسائل کو باہم اجتماعی طور پر اجتماعیت کے مفاد کے لیے استعمال کرنا۔

یہ وہ اساسیات ہیں، جن کی بنیاد پر چل کر آج دین کو غلبہ دلایا جاسکتا ہے۔ اور یہی بنیادیں آج کے دور کا تقاضا بنتی ہیں۔ اور انھی بنیادوں پر ایک بہترین بین الاقوامی نظام قائم کیا جاسکتا ہے۔ جس کو ہم دین کا غلبہ کہتے ہیں۔

www.rahimia.org

حوالہ جات

1۔ مفردات القرآن۔ خلف　　2۔ القرآن: 55:24۔　　3۔ القرآن 41:22

4۔ مسئلہ خلافت، ابوالکلام آزاد، ص 19، مکتبہ جمال، لاہور۔

5۔ حُجّة اللّٰه البالغه، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، باب كيفية استنباط الارتفاقات، مبحث ثالث، ج1۔

6۔ از الة الخفاء عن خلافة الخلفاء، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، مقصد اوّل، فصل اوّل در خلافتِ عامہ (فارسی متن بمع اردو ترجمہ) ج1، ص13، طبع قدیمی کتب خانہ، کراچی۔

7۔ ایضاً۔　　8۔ فیوض الحرمین، از امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ص197، طبع: محمد سعید اینڈ سنز، کراچی

9۔ خطبات و مقالات، ص100-99، طبع: دارالتحقیق والاشاعت، لاہور

10۔ ازالة الخفاء ص43 تا64۔　　11۔ ایضاً، ص9-8۔　　12۔ ایضاً، ص554۔

13۔ عن عبدالله بن مسعودؓ عن النّبیّ ﷺ، روه البخاری، حدیث نمبر 2652، و مسلم، حدیث نمبر 2533۔

14۔ ازالة الخفاء، ص358۔

15۔ البدایه و النّهایه لابن کثیر، الجزء السادس، خلافة ابی بکر صدیقؓ و ما ینها من الحوادث، ص6-305۔ سیرت ابن هشام، امر سقیفه بن ساعده، خطبه ابی بکر.

16۔ صدیق اکبر، از مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، ص29، طبع: مکتبہ رشیدیہ، کراچی۔

17۔ سنن ترمذی، کتاب المناقب، باب فی مناقب ابی بکر و عمر رضی الله عنهما کلیهما، حدیث نمبر 8679۔

18۔ صدیق اکبرؓ، ص28۔　　19۔ القرآن 40:9۔

20۔ مشکوٰة المصابیح، حضرت ابوبکر کے مناقب وفضائل، ج5۔

21۔ سیّدنا ابوبکر صدیق، ص446، مکتبہ دارالسلام، لاہور

22۔ فتح الباری، باب 3، و صنف ثالث استمروا علیٰ الإسلام لکنّهم جحدوا الزکوٰة و تأوّلوا بأنها خاصة بزمن النّبی ﷺ. حدیث 25-6924، ص8515۔

23۔ مشکوة شریف. جلد پنجم. حضرت ابوبکر کے مناقب وفضائل۔ حدیث نمبر 641.

24۔ ایضاً؟　　25۔ شعور و آگہی، ص14-113، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور

26۔ صحیح بخاری، حدیث 3621۔　　27۔ القرآن 55:24۔

28۔ البدایه و النهایه، ج6، ص316۔　　29۔ سیّدنا ابوبکر صدیق، ج1، ص503۔

30۔ مقالات حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ، ص:122۔

31۔ الفاروق، از علامہ شبلی نعمانی، ص:406۔

32۔ خلفائے راشدین، از شاہ معین الدین احمد ندوی، ص:143-44، طبع: ادارہ اسلامیات، لاہور و کراچی۔ والفاروق، ص:244، 260۔

33۔ الفاروق، ص:230۔　　34۔ ایضاً، ص:230۔　　35۔ خلفائے راشدین۔ ص:134۔

36۔ خلفائے راشدین۔ ص:135۔ وایامِ خلافتِ راشدہ، تالیف: مولانا عبدالرؤف رحمانی، ص:319، طبع: مکتبہ قدوسیہ، لاہور۔

37۔ خلفائے راشدین۔ ص:135-36، 163۔ واحکامِ شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، از مولانا تقی امینی، ص:209، طبع: الفصیل ناشران و تاجرانِ کتب، اردو بازار لاہور۔　　38۔ ایامِ خلافتِ راشدہ۔ ص:318۔

www.rahimia.org

39۔ ایضاً، ص: 311۔ 40۔ ایضاً، ص: 307۔ والفاروق، ص: 201، 204۔

41۔ الفاروق۔ ص: 218۔ 42۔ ایضاً، ص: 237۔

43۔ خلفائے راشدین، ص: 138، 154۔ و اسلام کا زرعی نظام، از مولانا تقی امینی، ص: 44، طبع: مکتبہ امدادیہ، ملتان۔ و احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، ص: 186۔ 44۔ خلفائے راشدین، ص: 59۔

45۔ الفاروق، ص: 188 تا 191۔

46۔ **عیون الأخبار، 55/1، نقلاً عن محض الصّواب:** 579/2، بحوالہ سیرتِ عمرؓ، ڈاکٹر **علی محمّد محمد الصلابی**، طبع: دارالسلام، لاہور۔

47۔ خلفائے راشدین، 151۔ الفاروق، ص: 291۔ 48۔ الفاروق، ص: 325۔

49۔ احکامِ شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، ص: 224۔ الفاروق، ص: 270۔

50۔ الفاروق، ص: 280۔ واحکامِ شرعیہ میں حالات و زمانے کی رعایت، ص: 225۔

51۔ عثمان ذوالنورین، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، ص 158، مولانا سعید احمد اکبر آبادی اکیڈمی، کراچی۔

52۔ فتح الباری 22/9۔ 53۔ ایضاً۔

54۔ عثمان ذوالنورین، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، ص: 286، مکتبہ رشیدیہ، کراچی۔

55۔ ایضاً، ص: 97۔ 56۔ ایضاً۔

57۔ عثمان ذوالنورین، ص 132۔ 58۔ المرتضٰی، ص 282۔

59۔ المرتضٰی، سیّد ابوالحسن علی ندوی، ص 275، طبع: البرہان پبلشرز، اردو بازار، لاہور، مارچ 2012ء۔

60۔ جامع الترمذی ج: 2، ص: 312، مناقب علی ابن ابی طالب۔ 61۔ ایضاً، ج: 2، ص: 412۔

62۔ تاریخ بنواُمیہ، از ڈاکٹر سعود الحسن خاں روہیلہ، (حصہ دوم)، ص: 153، طبع: غزنی پبلشرز، جناح روڈ، کوئٹہ، طبع اوّل 2009ء۔

63۔ **ازالۃ الخفاء**، ص 514 تا 516۔ 64۔ **هدی الساری فی مقدمة فتح الباری**، ص 459،

65۔ القرآن 40:12 66۔ المرتضٰی، ص 274۔

67۔ **التّفهیمات الإلٰهیه**، ج 1، ص: 77، 321۔ وقرآنی شعورِ انقلاب، مرتب: مولانا شیخ بشیر احمد لدھیانویؒ، ص: 452، طبع: رحیمیہ مطبوعات، لاہور

68۔ خلفائے راشدین، ص: 223۔ ازالۃ الخفا، ص: 274۔

69۔ سوانح حیات قطبِ عالم حضرت شاہ عبدالرحیم رائے پوریؒ، تصنیف: مفتی عبدالخالق آزاد رائے پوری، باب سلاسل مشائخ کا تاریخی تسلسل، طبع: رحیمیہ مطبوعات لاہور، طبع دوم: اگست 2016ء۔

70۔ **ازالۃ الخفاء**، فصل سوم، ص 100۔

71۔ القرآن 33:9۔

72۔ القرآن 8:5

73۔ **رواه البخاری، فی ترجمة الباب ''باب افشاء السلام من الاسلام'' تعلیقاً عن عمار ابن یاسر و رواه احمد فی مسنده مرفوعاً.**

☆

www.rahimia.org

خدا کے خوف سے عاری بہت سے نیک بندے!؟

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں — جس کو آپ خود مشاہدہ فرما رہے ہیں — آپ کی دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی ایک گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا اُمیدوار ہوں۔

بہت سے نیک بندے ہیں، جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکراللہ کی روشنی جھلک رہی ہے، لیکن جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ خدارا! اُٹھو! اور اس اُمتِ مرحومہ کو کفار کے نرغے سے بچاؤ تو اُن کے دلوں پر خوف و ہراس مسلط ہوجاتا ہے۔ خدا کا نہیں، بلکہ چند ناپاک ہستیوں کا اور ان کے سامانِ حرب وضرب کا۔ حال آں کہ ان کو تو سب سے زیادہ جاننا چاہیے تھا کہ خوف کھانے کے قابل اگر کوئی چیز ہے تو وہ خدا کا غضب اور اُس کا قاہرانہ انتقام ہے اور دنیا کی متاعِ قلیل (معمولی سامان) خدا کی رحمتوں اور اُس کے انعامات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔...

سکولوں اور کالجوں کے نونہالانِ وطن؛ میرے غم خوار

اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار — جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں — مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو مَیں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ (کالج) کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں — مدرسۂ دیوبند اور علی گڑھ کالج — کا رشتہ جوڑا۔ کچھ بعید نہیں کہ بہت سے نیک نیت بزرگ میرے اس سفر پر نکتہ چینی کریں اور مجھ کو اپنے مرحوم بزرگوں کے مسلک سے منحرف بتائیں، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ جس قدر میں بہ ظاہر علی گڑھ کی طرف آیا ہوں، اُس سے کہیں زیادہ علی گڑھ میری طرف آیا ہے۔''

(خطبہ صدارت افتتاحی اجلاس جامعہ ملیہ علی گڑھ، از حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، ص 77-76)

www.rahnuma.org

QUARTERLY
Shauor o Aaghi

January - March, 2019 Vol.11 Issue, 1 Regd. 370-S

رحیمیہ مطبوعات
رحیمیہ ہاؤس، 33/A کوئینز روڈ (شارع فاطمہ جناح) لاہور
00-92-42-36307714, 36369089 www.rahimia.org
info@rahimia.org /rahimiainstitute

www.rahimia.org